عصری مراٹھی کہانیاں

اذان

قاسم ندیم

www.urduchannel.in

اذان

(عصری مراٹھی کہانیوں کے تراجم)

ترجمہ و ترتیب

قاسم ندیم

URDU CHANNEL
Publications
7/3121 Gajanan Colony Govandi Mumbai -43 Ph 25556018,
25557484 Fax : 25587860 email : urduchannel@indiatimes.com

www.urduchannel.in

© متعلقہ مصنفین و نسیم ناز

کتاب	:	اذان
نوعیت	:	عصری مراٹھی کہانیوں کے تراجم
ترجمہ و ترتیب	:	قاسم ندیم
اشاعتِ اوّل	:	اپریل ۲۰۰۳ء
تعداد	:	ایک ہزار
زیرِ اہتمام	:	مظہر سلیم، قمر صدیقی
قیمت	:	۱۰۰ روپے
کمپیوٹر گرافی	:	اردو چینل اور یاسر وجاہت
سرورق	:	اعجاز صدیقی
ناشر	:	**اردو چینل پبلیکیشنز**

7/3121, Gajanand Colony, Govandi, Mumbai-43
Phone:25587860,25557484
Email:urduchannel@indiatimes.com

تقسیم کار:

☆ مکتبہ جامعہ ممبئی، دہلی، علیگڑھ ☆ سویرا بک ڈپو۔ مالیگاؤں
☆ اطفال بک ڈپو۔ مالیگاؤں
☆ تکمیل پبلی کیشنز، کوہِ نور ٹیچرس کالونی، شانتی نگر، بھیونڈی

رہائش : ۵۰۵/۹ لوٹس کالونی، گوونڈی، ممبئی ۴۳ ۴۰۰۰

اس کتاب کی اشاعت میں "مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکاڈمی" کا جزوی مالی تعاون شامل ہے

www.urduchannel.in

انتساب

امّی کے نام

جن کے لب ولہجہ میں

عربی

فارسی

دکنی اور

مراٹھی کی کھنک ہے۔

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

ترتیب

پیش لفظ	ڈاکٹر عبد الستار دلوی	۷
اپنی بات	قاسم ندیم	۱۱
ہٹو بھی	وی۔ سا۔ کھانڈیکر	۱۳
مدرسہ	ونکٹیش ماڈگولکر	۲۰
ساتھ	مدھو منگیش کرنک	۲۷
فساد	ارون سادھو	۳۵
بے نام	و۔ پو۔ کالے	۴۶
سفارش	گنگادھر گاڈگل	۵۴
پرندہ	دیا پوار	۶۲
شور	آ۔ ن۔ پیڈنیکر	۶۸
نجات	گوری دیشپانڈے	۷۴
آزادی	شیلجا کالے	۸۰
اذان	ولاس سوبیتے	۹۲
اندھیرا اجالا	انورادھا ویدیہ	۱۰۱
پارٹی	م۔ ل۔ ورہانڈے	۱۱۳
آہٹ	ماروتی چتم پلی	۱۲۳
منّت	مدھو کر دھرماپور کر	۱۲۹
گھٹن	وبھاوری شرور کر	۱۳۸

www.urduchannel.in

قاسم ندیم کے ذریعے ترتیب دی گئیں کتابیں

''تکمیل'' حمد و مناجات نمبر
ماہ نامہ ''تیرِ نیم کش'' عالمی کہانی نمبر
''سد بھاؤنا درپن'' مراٹھی ساہتیہ نمبر
''سد بھاؤنا درپن'' پاکستانی ادب نمبر
''بیت بازی'' پر مبنی کتاب

زیرِ ترتیب کتابیں

''امّی'' مسلم کرداروں پر مبنی ہندی کہانیوں کا انتخاب
''مجھے گھر چاہیے'' مراٹھی ادب کی خواتین کہانی کاروں کا انتخاب
''بھیتر باہر آگ ہے'' دوہوں کا مجموعہ
''روبرو'' اردو ادیبوں اور شاعروں سے لیے گئے انٹرویوز
''درد کی بوندیں'' عصری مراٹھی نظموں کا انتخاب
''خواب، تتلی اور بَن'' بچوں کی کہانیاں

www.urduchannel.in

پیش لفظ

پروفیسر عبدالستار دلوی
(سابق کرشن چندر پروفیسر وصدر شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی)

اردو اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں گہرے لسانی رشتے ہیں۔ اب یہ رشتے ادبی رشتوں میں بھی تبدیل ہو رہے ہیں۔ یہ رشتے بھی کم وبیش دو سو سال پر محیط ہیں، مگر ادھر تین دہائیوں سے ان ادبی رشتوں اور اس ادبی لین دین میں تیزی آئی ہے۔ اور یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ ان ادبی رشتوں میں ترجموں نے اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو ایک کل ہند رابطہ کی زبان ہے۔ لہٰذا اس کا لسانی اور ادبی رشتہ ملک کی سبھی زبانوں سے قائم ہے۔ یہ رشتہ ایک طرح کی تہذیبی اور لسانی ذمہ داری بھی ہے جو اردو کے حصے میں آئی ہے اور اردو اور علاقائی زبانوں کے شاعر اور ادیب اس کا بھرپور احساس رکھتے ہیں۔ اردو کے یہ رشتے اور ذمہ داریاں ہند آریائی زبانوں کے علاوہ دراوڑی زبانوں سے بھی وابستہ ہیں اور اس سمت میں کہیں تیز اور کہیں مدھم سُروں میں یہ کام جاری ہے۔

مہاراشٹر میں اردو اور مراٹھی کا لسانی اور ادبی رشتہ زمانۂ قدیم سے پایا جاتا ہے۔ مراٹھی سے اردو میں ترجمہ کی خشتِ اوّل شاہ تراب چشتی نے رکھی تھی۔ انھوں نے وجودی فلسفہ کے زیر اثر رام داس کی ''منا چے شلوک'' کا آزاد اردو ترجمہ ''من سمجھاون'' کے نام سے کیا تھا، جس کی اپنی کلاسیکی اہمیت ہے۔ مراٹھی سے اردو میں ترجمے کی دوسری مثال آنندی بائی جوشی کی مشہور زمانہ مراٹھی خودنوشت کا اردو ترجمہ ہے جس کا ایک نسخہ راقم کے پاس ہے۔ آنندی بائی جوشی کی خودنوشت ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی تھی اور اس کا پہلا ترجمہ ہندوستانی زبانوں میں اردو میں ہوا۔ ۱۸۸۳ء میں کیا ہوا یہ اردو ترجمہ احمد علی شوق مرحوم کی یادگار ہے۔

www.urduchannel.in

اردو میں مراٹھی تراجم کا یہ سلسلہ موجودہ لسانی اور سیاسی منظر نامہ میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ ترجمے کی اس ضرورت نے ادبی اور تہذیبی فکر کو جلا بخشی ہے اور ہمارے لسانی اور ادبی شعور کو وسعتیں عطا کی ہیں اور چھوٹی چھوٹی علاقائی تہذیبوں کو سمجھنے میں مدد کی ہے۔ اور ادبی شعور کو طاقت و توانائی عطا کی ہے۔ گذشتہ تین دہائیوں میں مراٹھی سے اردو میں ترجمہ کی اولین کوششیں نور پرکار اور بدیع الزماں خاور نے کی تھیں۔ ان کی ان کوششوں نے بعد میں ایک تحریک کی صورت پیدا کی اور مراٹھی سے اردو میں ترجمہ کرنے والا ایک بڑا حلقہ پیدا ہوا جس میں سلام بن رزاق، خالد اکاسکر، وقار قادری، محمد حسین پرکار، معین الدین جینا بڑے، یونس اکاسکر، معین الدین عثمانی، انجم عباسی اور راقم الحروف کے نام شامل ہیں جنھوں نے مراٹھی فکشن کے اردو تراجم کیے۔ مراٹھی کے شعری تراجم میں بدیع الزماں خاور مرحوم اور یعقوب راہی کے تراجم غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ کچھ ترجمہ نگار ایسے بھی ہیں جنھوں نے براہ راست مراٹھی کی بجائے ہندی سے اردو میں تراجم کیے۔ ادبی قدر و قیمت کے لحاظ سے یہ بھی کم اہم نہیں ہیں اور ان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ براہ راست مراٹھی سے تراجم کے مقابلے میں جس میں کم درجہ کا فکشن بھی شامل ہے، ہندی سے تراجم منتخبہ تراجم ہیں اور یہ ان تراجم کی بڑی خوبی ہے۔ تراجم کرتے وقت ''انتخاب'' کی اہمیت ''تراجم'' کی اہمیت سے زیادہ ہے۔ وہ لوگ جو براہ راست ترجموں کے تعلق پر زور دیتے ہوئے خودستائی سے کام لیتے ہیں وہ ترجمہ کرتے وقت اس پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ انھوں نے درباداری اور دوست نوازی یا تعلقات بنانے کی کوشش میں کم تر درجے کے فکشن کو اپنے تراجم کی زینت بنایا ہے۔ اس طرح کی ادبی نوازشات ترجمہ کا المیہ بن جاتی ہیں۔

گذشتہ کئی برسوں سے مراٹھی سے اردو میں ترجمہ کرنے والوں میں ایک نمایاں اور بہت اہم نام قاسم ندیم کا ہے۔ وہ گذشتہ تقریباً دس برسوں سے مراٹھی افسانوں کو اردو میں منتقل کرنے کا کام بہت خوبصورتی اور اعلیٰ درجہ کی فنکاری سے کرنے میں مصروف ہیں۔ 'کتاب نما' (دلی) 'سب رس' (حیدرآباد) اور اردو کے دیگر ادبی رسائل میں ان کے تراجم اشاعت پذیر ہوئے ان کی ترجمہ نگاری نے مراٹھی سے اردو میں تراجم کے اعلیٰ نمونے پیش

www.urduchannel.in

کیے ہیں۔ ان کا ولاس موہیتے کی کہانی کا ترجمہ ''اذان'' کتاب نما (دلّی) میں جب شائع ہوا، میں دلّی میں موجود تھا، اس وقت اس ترجمہ کو اعلیٰ علمی و ادبی حلقے میں بے انتہا پسند کیا گیا تھا اور یہ ترجمہ موضوعِ گفتگو تھا، یہ اظہار پسندیدگی کہانی کے انتخاب اور ترجمہ نگاری کی وجہ سے تھی۔ خوشی ہے کہ قاسم ندیم نے اپنی اس دلچسپی کو قائم رکھا اور مسلسل منتخب مراٹھی افسانوں کو اردو میں منتقل کر کے ایک اہم ادبی، لسانی اور تہذیبی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے لاتعداد جدید مراٹھی کہانیوں کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ انور ادھاودیہ کا ''اندھیرا اجالا''، ماروتی چتم پلّی کا ''آہٹ''، مراٹھی کی مشہور دلت کہانی ''پرندہ'' مصنف دیا پوار، اس سلسلے کی چند کہانیاں ہیں جو موضوع، زبان اور ترجمہ نگاری کی نادر مثال ہیں۔ قاسم ندیم کی ترجمہ کی ہوئی یہ کہانیاں اگرچہ مراٹھی سے ترجمہ ہیں، لیکن کئی ترجمے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے غماز ہیں۔ ''اذان'' ان میں سے ایک ہے۔ ہر نظم یا کہانی کا تخلیقی ترجمہ ممکن نہیں اس کا تعلق زیادہ تر مترجم کے موڈ پر ہوتا ہے۔ قاسم ندیم کے تراجم بھی اسی موڈ کی طرف اشارہ کرتے ہیں، کئی تراجم اچھے رواں دواں ترجمے ہیں۔ جن میں غرابت کا احساس نہیں ہوتا (اور یہ خود ترجمے کی بڑی خوبی ہے) تو چند ترجمے تخلیقی ترجمے ہیں اور ترجمہ، ترجمہ معلوم نہیں ہوتا۔ ترجمہ کی یہ خوبی سلام بن رزاق اور خالد اگاسکر کے ترجموں میں بھی ہے جن کے تراجم بھی منتخب مراٹھی کہانیوں کے تراجم ہیں۔

میں جناب قاسم ندیم کو ان کے اس ترجمہ شدہ افسانوں کے مجموعے ''اذان'' پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کا یہ ادبی سفر جاری رہے گا اور وہ آئندہ بھی اپنی نگارشات سے نہ صرف اردو زبان کو مالا مال کریں گے بلکہ اردو اور مراٹھی زبانوں میں لسانی اور فکری ہم آہنگی پیدا کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ ادبی کاوش اردو کے ادبی حلقوں میں نہ صرف پسند کی جائے گی بلکہ اس کی خاطر خواہ پذیرائی بھی ہوگی۔

۳ر الہلال، باندرہ ریکلیمیشن، ممبئی۔۴۰۰۰۵۰

www.urduchannel.in

www.urduchannel.in

اپنی بات

ہندوستان میں کئی علاقائی اور ریاستی زبانیں موجود ہیں۔ان میں سے کئی زبانوں کا اردو سے قریبی رشتہ ہے۔اردو کے ساتھ ان زبانوں میں ادبی 'لین دین' یا 'آدان پردان' ہوتا آیا ہے۔ہندوستان گیر پیمانے پر دیکھا جائے تو یہ سلسلہ اردو اور مراٹھی میں صدیوں پر محیط ہے۔صوفی سنتوں سے لے عصر جدید تک یہ سلسلہ جاری وساری ہے۔مراٹھی سے اردو میں ترجمہ کرنے والوں کی فہرست میں کئی نام ایسے شامل ہیں جن کی کاوشیں سشدر کر جاتی ہیں۔جن کے تراجم نئے مترجمین کے لیے مشعل راہ بنتے رہے ہیں۔پروفیسر عبدالستار دلوی، سلام بن رزاق، ڈاکٹر یونس اگاسکر، خالد اگاسکر، محمد حسین پرکار، انجم عباسی، وقار قادری، م ناگ، معین الدین عثمانی کا شمار میرے پسندیدہ مترجمین میں ہوتا ہے۔محولہ بالا مترجمین نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مراٹھی فکشن کو بہتر انداز میں اردو روپ عطا کیا ہے۔انھیں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے میں نے دس سال کے دوران تقریباً ۷۵ مراٹھی کہانیوں کو اردو جامہ پہنایا ہے۔جو مختلف ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوئی ہیں۔مجھے اپنی فہم وفراست کا دعویٰ نہیں ہے۔میں اپنی کم علمی اور بے مائگی کا معترف رہا ہوں۔مجھ سے جو بن پڑا وہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اس مجموعہ میں شامل کہانیوں سے متعلق ایک سیر حاصل مضمون بھی لکھا جا سکتا تھا۔لیکن میں قاری اور کہانی کے درمیان اپنے علم کا بکھان نہیں کرنا چاہتا۔ترجمہ و انتخاب سے متعلق ایک قاری کی رائے میرے نزدیک سب سے معتبر درجہ رکھتی ہے۔آپ کی رائے سر آنکھوں پر۔

www.urduchannel.in

جن کہانی کاروں کی کہانیاں اس مجموعے میں شامل ہیں میں ان کا شکر گزار ہوں۔ پروفیسر عبدالستار دلوی صاحب کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ انھوں نے ''پیش لفظ'' لکھا۔ ڈاکٹر رام پنڈت نے اپنی قیمتی رائے سے نوازا اس لیے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ سلام بن رزاق صاحب اور وقار قادری کے مفید مشوروں کے لیے شکر گزار ہوں۔

اپنے قریبی دوستوں میں علی عمران، عبدالعظیم، ذاکر حسین، انھوں نے ہر مرحلے اور ہر قدم پر حق دوستی ادا کیا۔ سید عزیز بھائی، سید لعل بھائی اور سید ذاکر نے دور یتیمی میں میرے دکھ درد بانٹے اور مجھے بکھرنے سے بچایا ساتھ ہی بھائی لیاقت علی، شوکت بھائی، شیخ خلیل احمد، اکبر عابد، قریشی جلال بھڑگانوی، شیخ رحمن ملکاپوری کا بھی مشکور ہوں کہ انھوں نے میرا حوصلہ بڑھایا۔

عزیز دوست مظہر سلیم، برادرم قمر صدیقی اور آرٹسٹ اعجاز صدیقی نے اس مجموعے کی اشاعت کے لیے انتھک کوششیں کیں۔ ساتھ ہی اعجاز شیخ اور منصور خان نے بھی اس کام میں ہاتھ بٹایا اس لیے میں ان سب کا ممنون و مشکور ہوں۔ شریک حیات نسیم ناز کا تہہ دل سے مشکور ہوں کہ وہ ہر قدم پر میرا حوصلہ بڑھانے میں پیش پیش رہتی ہیں۔

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکاڈمی کا بھی شکر گزار ہوں کہ جس کے جزوی مالی تعاون سے یہ مجموعہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آیا ہے۔

قاسم ندیم

www.urduchannel.in

ھٹوبھی

وی۔ س۔ کھانڈیکر

میری جلد بازی دیکھ کر بیوی نے پوچھا۔ آج کدھر کی تیاری ہورہی ہے؟ کہیں گاؤں جانے کا پروگرام ہے کیا؟ ڈاکٹر کی بیوی کو، مطلب یہ کہ ایسے ڈاکٹر کی بیوی کو جس کی پریکٹس زوروں سے چل رہی ہو۔ شوہر کے باہر جانے کی اتنی پرواہ نہیں رہتی۔ ویسے میں نے گردن ہلا کر "نہ" کہہ دیا ہوتا۔ مگر میرا دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔ خوشی بھی ایسی جسے چھپانا مشکل تھا۔ میں نے کہا، باہر جانا ہی ہوتا تو تمہیں کم سے کم ایک گھنٹہ پہلے تو کہہ دیا ہوتا۔

"کیوں؟"

"کم سے کم ایک گھنٹہ پہلے اطلاع ملے بغیر عورتیں باہر نکل ہی نہیں سکتیں۔"

www.urduchannel.in

اس نے گردن نچائی۔ مگر گردن کا نچانا سیدھا سادہ نہیں تھا۔ ہاتھ اور آنکھ سے ہونے والے خاموش رمز و کنایوں سے زیادہ پر اثر گردن ہلانا ہو سکتا ہے جیسے گائیک ایک سُر میں گیت کا اثر ظاہر کر دیتا ہے، اُسی انداز میں وہ گردن مٹکا کر بولی، اچھا، اچھا رہنے دیجئے، ہمیشہ تو جیسے ساتھ لے جاتے ہیں؟

خاموشی میں جو اظہار کیا جاتا ہے اس فن میں مرد، عورت سے بہت پیچھے ہوتا ہے۔ شیشے کے سامنے ٹائی باندھتے ہوئے میں نے کہا۔

''ارے بھائی، سفر میں کسی کا ساتھ تو ہونا ہی چاہئے، یہ بیوی کا ساتھ؟''

ہنستے ہوئے اس نے پوچھا۔ اگر کوئی خواتین کی جانب سے بولنے والا ہوتا تو یقیناً اس نے لیکچر جھاڑ دیا ہوتا۔ میری قسمت اچھی تھی۔ کوئی مریض دروازے میں آ کھڑا ہوا اس سے پہلے ہی مجھے گھر سے باہر چل دینا تھا۔ اور سیدھے۔ ٹینس کورٹ پہنچ جانا تھا۔ آج ٹینس کا شاندار میچ ہونے والا تھا۔ اور خوشی میں میں پھولے نہیں سما رہا تھا۔

شاید آپ کو ہنسی آئے گی۔ ایک ٹینس میچ کی وجہ سے ڈاکٹر ناچنے کیوں لگا؟ مگر میں کہتا ہوں وہ کیوں نہ ناچے؟ پرانے کھلاڑی کی یہی تو حالت ہوتی ہے۔ کالج کے فرسٹ ائیر میں جب میں تھا تب میں نے ٹینس چمپئن پروفیسر مراٹھے کو شکست دی تھی۔ پروفیسر کو ٹینس کھیلنے کا بے حد شوق تھا۔ ان کا اکیلا بیٹا چل بسا تھا۔ پھر بھی پروفیسر چوتھے دن کورٹ پر حاضر تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے انھیں دیکھا تھا۔ مگر ڈاکٹر بننے کے بعد ٹینس کھیلنا میرے لیے ناممکن سا ہو گیا تھا۔ میرے والد نے مجھے آگاہ کر دیا تھا، اس کھیل کے چکر میں نہ پڑنا۔ اگر کہیں اسی میں الجھے رہے تو پریکٹس چوپٹ ہو جائے گی۔

ایسی ہی حالت میں ہمارے شہر کے دو مشہور کھلاڑیوں کے میچ دیکھنے کے لیے میں نے اسپتال کی چھٹی دے رکھی تھی۔ اسے کیا آپ میرا جرم کہیں گے۔ اسکول میں بچے ایسا ہی کرتے ہیں۔ برے آدمی بھی تو آخر دنیا کے مدرسے کے طلبہ ہی ہیں۔

میں جمخانہ وقت پر پہنچ گیا۔ جلدی میں کرسی پر بیٹھ کر میں رومال سے پسینہ صاف کرنے لگا پھر ادھر اُدھر نگاہ ڈالی میری دائیں طرف پروفیسر مراٹھے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ آج

www.urduchannel.in

پچاس کے پیٹے میں ہو کر بھی وہ اپنا کام چھوڑ کر میچ دیکھنے آئے تھے۔ پل بھر مجھے یہی احساس ہوا بعد میں مجھے خیال آیا کہ پروفیسر مراٹھے تو پانچ سال سے ممبئی میں رہتے ہیں۔

انسان کا دل بڑا عجیب ہوتا ہے، ندی کی طرح لہر دار، سمندر سا عجیب! ہسپتال آنے والے کئی لوگوں کی گالیاں برداشت کر کے میں میچ دیکھنے آ بیٹھا تھا۔ میچ شروع ہونے پر میرا دل عجیب باتوں میں غوطے کھانے لگا۔ پروفیسر مراٹھے کے چہرے کی اور دیکھ کر مجھے لگا بڑے میاں ابھی ہٹے کٹے ہیں۔ اور پھر ہوں بھی کیوں نہ؟ اکیلے لڑکے کی موت کے بعد بھی جن کی آنکھوں میں آنسو نہ آئے، ان پر زمانہ اور وقت کا کیا اثر ہونے والا ہے؟

اور وہ عجیب واقعہ میری آنکھوں کے سامنے برسوں کے پردے کے پیچھے صاف دکھائی دینے لگا۔ میرا کلاس فیلو مادھو مراٹھے بھی باپ جیسا ہی ٹینس کھیلتا تھا۔ ٹائفائیڈ سے ایک دن صبح انتقال کر گیا۔ مگر بارہ بجے پروفیسر مراٹھے کالج میں حاضر تھے۔ طلبہ کو محسوس ہوا آخر یہ انسان ہے یا حیوان؟ مراٹھے جی شاعری کا مطالعہ خوب کرتے تھے۔ اس بنا پر لوگوں کو اور تعجب ہوا۔ اپنے لیکچر کے دوران لفظوں میں جو رس گھول دیتے تھے وہ آج بنا آنسو بہائے ہی آ گئے۔ لڑکے کے مرنے کے بعد ادھر راکھ بھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی ادھر اس کے باپ کالج میں لیکچر دینے آ گئے۔ گہری کھدائی کرنے پر پتھر سے بھی پانی نکل آتا ہے مگر انسان کی............

پروفیسروں کے کہنے پر مراٹھے جی نے کلاس نہیں لیے۔ مگر ان کے معمولات میں فرق نہیں آیا تھا۔ چار بجے تک وہ کالج میں کتابیں پڑھتے رہے۔ حسب معمول دو کپ چائے نوش فرمائی اور سب سے عجب بات تو یہ تھی کہ وہ اسٹاف روم میں بیٹھے بیٹھے عادتاً مذاق بھی کرتے رہے۔ ادھر مادھو کی ماں رو رہی ہوگی اور ادھر یہ صاحب ہنسی مذاق کر رہے ہیں۔

انسان کا دل اتنا پتھر ہوگا۔ اس کا تجربہ میں کبھی نہ بھلا سکا۔ مجھے پریکٹس کے دوران موت کے کئی بار درشن ہوئے ہیں۔ دنیا میں پتھر دل بہت ہیں مگر موت کے سرد ہاتھوں کے لمس سے جس کا دل دہلتا نہیں، ایسا انسان میں نے نہیں دیکھا۔ پروفیسر مراٹھے کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ صاحب زندگی میں کبھی روئے نہیں ہوں گے۔

دوڑتی موٹر گاڑیوں کے درمیان جیسے کوئی راستہ پار کرتا ہے اسی طرح سامنے چل

www.urduchannel.in

رہے کھیل کا مزہ میں لیتا رہا اور دل میں چل رہے خیالات کا اژدھام دیکھتا رہا۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو میرا وہاں بیٹھنا ناممکن تھا۔

پہلا سیٹ ختم ہوتے ہی مراٹھے جی نے میری جانب ہنس کر دیکھا۔

''آپ نے مجھے پہچانا؟'' ''کیوں نہیں!''

انھوں نے میرا نام ''ڈگری'' ہسپتال کا پتہ سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتا دیا۔ پتہ نہیں شاید دل نہ ہونے پر قوتِ حافظہ بڑھ جاتی ہے۔ مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے بول اٹھے ''مادھو کے ساتھ ہی پڑھتے تھے آپ'' جس باتوں کو میں دل سے نکال دینا چاہتا تھا، اسے انھوں نے ہی کرید لیا۔ آواز میں لرزش نہ تھی، آنکھوں میں درد نہ تھا۔ جیسے مادھو کی موت کے بارے میں انھوں نے تاریخ میں پڑھا ہو۔

ان کی اس بے حسی کی وجہ سے میرے چہرے پر نفرت کی سلوٹیں ابھر آئیں تھیں۔ شاید وہ آگے مجھ سے بولتے ہی نہیں میرے دل میں عجیب اتھل پتھل ہونے لگی اور بے شمار خیالات آنے جانے لگے۔ مادھو کی موت کے بعد پروفیسر مراٹھے جی نے کئی کتابیں لکھ کر نام کمایا تھا۔ ایسے ذہین انسان کا دل پتھر جیسا کیوں ہے؟ راہ نما چٹان پر ہی تو بنایا جاتا ہے، ویسی ہی کہیں عقل کی بات تو نہیں ہے؟

میں ٹینس کورٹ سے ہسپتال اور وہاں سے گھر آ گیا پھر بھی میرے دل میں عجیب ہل چل قائم رہی۔ کبھی کبھی آسمان گھونگھٹ ڈالے بیٹھا رہتا ہے نہ سورج دکھائی دیتا ہے نہ پانی برستا ہے میرے دل کی کیفیت بھی وہی تھی۔

کپڑے تبدیل کرنے سے پہلے ہی ایک آدمی چھٹی اور موٹر لے کر آیا۔ چٹھی پروفیسر مراٹھے کی تھی، مہربانی کر کے جلد آیئے۔ دوائیاں بھی ساتھ لائیں۔ ''کون بیمار ہے، اسے کیا ہو رہا ہے، یہ لکھا ہی نہ تھا۔ بیوی نے مجھے کھانا کھا کر جایئے، کا حکم دیا۔ مگر اس کی جانب دھیان نہ دے کر میں ویسے ہی چل دیا۔

دروازے پر ہی پروفیسر مراٹھے کھڑے تھے، تین گھنٹے میں کتنے بوڑھے ہو گئے تھے۔ ایک رات میں جلتے جہاز پر کسی کیپٹن کے بال سفید ہونے کی کہانی میں نے پڑھی تھی۔

www.urduchannel.in

مگر مراٹھے جی کے چہرے پر جو تبدیلی آ گئی تھی وہ اس کہانی سے بھی عجیب تھی جیسے صبح انھوں نے جوان کا روپ دھار لیا تھا اور گھر آ کر رنگ دھوڈالا تھا۔ چہرے پر جھرّیاں اور عجیب سی دھنسی دھنسی آنکھیں۔ میں چپ چاپ ان کے پیچھے پیچھے اندر گیا۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ ہی ایک کمرہ تھا۔ میرے اندر جاتے ہی مریضہ کے اردگرد بیٹھے ہوئے لوگ ہٹ گئے۔ قریب پچاس سال کی ایک عورت، بستر پر نڈھال پڑی تھی۔ میں نے نبض دیکھی۔ میری دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ میں نے خود پو قابو رکھا۔ مراٹھے جی کی نگاہیں میری اور تھیں۔ اسے میں جان گیا تھا۔ جیسے چھوٹا بچہ اپنی ماں کی اور دیکھتا ہے ویسے ہی وہ اس عورت کی جانب دیکھ رہے تھے۔

''ٹھیک ہو جائے گی نا؟''

جھوٹ بولنا ڈاکٹر کا پیدائشی حق ہے۔ ''کوئی خاص بات نہیں! ایک انجکشن دیتے ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔'' انجکشن دینے کے بعد باہر آنے تک میری جانب آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ باہر آتے ہی وہ اپنے کمرے میں مجھے لے گئے۔ بیٹھئے ڈاکٹر صاحب!

ایک آرام کرسی کی اور اشارہ کر کے انھوں نے کہا۔ ''بیٹھو، کہئے نا! میں تو آپ کا شاگرد ہوں۔''

''اچھا بھائی، بیٹھو۔''

بیٹھتے بیٹھتے ٹیبل پر پڑے ہوئے کاغذات میں نے دیکھے۔ پروفیسر کی نئی کتاب کے پروفس تھے۔ اِدھر اُدھر چکّر لگاتے لگاتے رک کر وہ بولے۔ ہوا پانی کی تبدیلی کے لیے اسے یہاں لایا ہوں۔ مگر.....

''اس بیماری کو کتنے دن ہو گئے؟''

''ویسے دو تین سال ہو گئے۔ پہلے اس نے خبر ہی نہ ہونے دی۔ یہ ہارٹ ٹربل بھی عجیب.....ان کا جملہ مکمل کرنا میرے لیے مشکل تھا۔ دونوں ہاتھ پیچھے رکھ کر انھوں نے تین چار چکّر لگائے۔ پھر ٹھہر کر انھوں نے پوچھا۔ ''تمہاری شادی ہو گئی ہے نا؟''

یہ جملہ ادا ہوتے ہی میری زبان لڑکھڑا گئی۔ آج اگر مادھو ہوتا تو ان کا گھر بھی بچّوں کی کلکاریوں سے گونجتا۔ شاید ایسا ہی خیال ان کے دل میں بھی ابھرا ہو۔ اور اب تو ان

www.urduchannel.in

کی بیوی بھی موت کی دہلیز پر کھڑی ہوئی ہے۔ میں نے ان کی جانب دیکھا وہ کسی اور ہی خیال میں کھوئے ہوئے تھے۔ دو چار چکر لگانے کے بعد وہ پھر ٹھہر گئے اور میرے قریب آ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس لمس میں اپنائیت نہیں تھی۔ نہ ہی انھوں نے رسمی طور پر ہاتھ رکھا۔ جیسے لاچار آدمی کچھ مانگ رہا ہو۔ ایسا احساس تھا۔ میں اٹھنے لگا، تبھی بولے ''بیٹھو، بیٹھو، یہ کالج تھوڑی ہی ہے۔''

اس جملے سے مجھے ہنسی آ سکتی تھی۔ مگر تبھی پاس کی ایک کرسی کو قریب کھینچ کر وہ میرے سامنے بیٹھ گئے۔ ان کی آنکھیں مجھے صاف صاف دکھائی دیں۔ اس ویرانگی کو دیکھ کر میں ڈر گیا۔ میرا ہاتھ انھوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ان کے ہاتھ پیلے پڑ گئے تھے اور کانپ رہے تھے۔ وہ ایک دم بولے۔! ڈاکٹر.....وہ بول ہی نہیں پا رہے تھے۔ میں نے ان کا ہاتھ مضبوطی سے دبا کر کہا۔ ''ہمت نہ ہاریئے۔ آپ بھی چھوٹے بچوں کی طرح.....''

''میں چھوٹا بچہ ہی ہوں ڈاکٹر!''

خوبصورت اور جوان بیوی کی بیماری میں اس کی موت سے ڈرنے والے شوہر میں نے دیکھے تھے، بیوی کے بعد بال بچوں کا کیا ہوگا؟ اس فکر سے ڈگمگانے والے شوہر میں نے دیکھے تھے۔ مگر اکلوتے لڑکے کی موت پر نہ ڈگمگانے والا آدمی، پچاس سال کی بیوی کی موت سے ڈر رہا تھا..... یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

''سچ، چھوٹا بچہ ہی ہوں میں ڈاکٹر! میری ماں.....عجیب بات لگے گی آپ کو پچپن سال کے بچے کی ماں، اس کی بیوی ہی ہوتی ہے۔''

میں ٹکٹکی باندھے انھیں دیکھتا رہا۔

''ڈاکٹر، زندگی میں ڈھلتی عمر کا سفر بہت مشکل ہوتا ہے۔ کئی لوگ ملتے ہیں، مگر بیوی کے بغیر اس سفر میں اور کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ ماں باپ کی محبت بچے کی شادی ہونے کے بعد کچھ کم ہو جاتی ہے۔ بچے بھی کیا۔ پر نکلتے ہی نیا گھر بسانے چل دیتے ہیں۔''

ان کی ہمت کس طرح بڑھاؤں، میں سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا۔

''ڈاکٹر، مادھو گیا! اس دن میں کالج آیا تھا۔ اس پر دنیا ہنسی اڑا رہی تھی۔ مگر سچ بتاؤں

www.urduchannel.in

اس وقت میرے سامنے کام کے پہاڑ تھے۔ وہ پہاڑ سر کرتے وقت قدم قدم پر دھوپ میں رہ کر میرے لیے سایہ کرنے والی ہم سفر میرے ساتھ تھی۔ اس وجہ سے میرے قدم نہ ڈگمگائے۔ گھر میں آئی موت کو میں برداشت کر گیا۔ مگر مادھو کے انتقال پر چھپائے ہوئے آنسو۔ ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ پل بھر اوپر دیکھ کر وہ بولے، ''ڈاکٹر پچیس سال تک بیوی کے بدن سے محبت رہتی ہے۔ چالیس سال کی عمر میں بچے کی ماں ہونے کی وجہ سے محبت میں ٹھہراؤ آجاتا ہے مگر بڑھاپے میں دوستانہ ماحول میں محبت بڑھنے لگتی ہے شاید آپ ہنسیں گے۔ مگر مادھو کے جانے کے بعد میں نے پندرہ سال اسی طرح محبت کی ہے۔ جوانی کی محبت تو شراب کی طرح ہوتی ہے مگر جسم کی غلامی کے بعد آزاد ہونے پر دلوں میں اتفاق پیدا ہو جاتا ہے۔ خالص امرت کی طرح محبت ہوتی ہے۔ اسی خالص امرت کو مجھ سے چھیننے موت آگئی ہے، یہ خیال ہی.....''

خوشی کی طرح دکھ میں بھی آدمی زیادہ بولنے لگتا ہے۔ پروفیسر کی یہی حالت ہوگئی۔ وہ ایک دم کھڑے ہو کر زور سے بولنے لگے۔ ''ڈاکٹر، میں نے اتنی کتابیں پڑھی ہیں مگر اس کا سارا کریڈیٹ میری بیوی کو جاتا ہے.....اگر وہ امنگ نہ پیدا کرتی تو میں آدمی بن ہی نہ پاتا۔ مادھو کی موت پر میں نے ایک آنسو بھی نہ بہایا.....مگر اب..... ؟

اندر سے بلاوا آیا اس لیے ہم دونوں اندر چلے گئے۔ انجکشن کے اثر سے ان کی بیوی نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ بیوی کے قریب گئے۔ بیوی کے پژمردہ چہرے پر ہلکی سی مسکان ابھری تو مجھے بھی خوشی ہوئی۔

بیوی کے سفید بالوں کو سنوارتے ہوئے انھوں نے پوچھا، ''اب ٹھیک لگ رہا ہے نا؟''

''ہاں، مگر یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟''

بال سنوارتے سنوارتے ان کی آنکھوں سے آنسو بکھرنے لگے۔ آنسوؤں کو پونچھنے کے لیے بیوی نے اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھایا اور بولی ''ہٹو بھی'' ڈاکٹر کیا کہیں گے..... سیکڑوں محبت کی کہانیوں میں ''ہٹو بھی'' لفظ میں نے پڑھا تھا۔ مگر اس کا مفہوم مجھ پر آج ہی واضح ہوا تھا.....

☆☆☆

www.urduchannel.in

مدرسہ

ونکٹیش ماڈگولکر

دوپہر ہوئی مدرسے کے سامنے لٹکی ہوئی گھنٹی ایک لڑکے نے لکڑی کے کندے سے بجائی۔ اس کی آواز سارے دیہات میں گونج اٹھی۔ چھوٹا دینو گائے کے کوٹھے میں تھا۔ کتے کے پلّے کے لیے پتھر مٹی کا ایک چھوٹا سا گھروندہ بنانے میں مگن تھا۔ مدرسے کی گھنٹی اسے سنائی نہیں دی۔ آنگن میں گدڑی بچھا کر ماں لیٹی تھی۔ اس نے گھنٹی کی آواز سنی اور لیٹے لیٹے ہی بول اٹھی۔ "گھنٹی بج گئی ہے، دیکھ دینو مدرسے جا۔" اس طرح تین چار بار اسے چلانا پڑا۔ تب کہیں دینو بے دلی سے اٹھا۔ پیر جھاڑتا ہوا اور ہاتھ نچاتا ہوا اماں کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ پھر چلّا کر کہا۔ "وہ، میری تختی دو، کتاب دو اور پینسل دو!"

www.urduchannel.in

ماں کو اٹھنا پڑا۔ جب تک دینو نھا منا تھا اس کے لیے سب کچھ کرنا لازمی تھا۔ پڑھ لکھ کر، ہوشیار بن کر مستقبل میں اپنی بیوہ ماں کا وہ سہارا بنے گا۔ اسے راحت پہنچائے گا۔

کیل پر ٹنگی ہوئی تختی، چلکی کے پاس مڑی تڑی کتاب اور پنسل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا لے کر اس نے دینو کے ہاتھ میں تھما دیا۔ انھیں لیتے وقت کیچڑ میں لت پت ہاتھ ماں کو دکھائی دیئے ماں نے غصے سے کہا، "جا کنوئیں پر جا کر ہاتھ دھو آ، گندہ کہیں کا۔" دینو اور زیادہ جھنجھلا گیا۔ ہاتھ کیوں دھونے چاہئے؟ ذرا سوکھنے پر زور سے مل دیئے تو سارا کیچڑ مٹی اپنے آپ نکل جائے گی۔ ماں بھی کتنی عجب ہے! وہ ڈن ڈن پیر پٹکتا ہوا پچھواڑے گیا صاف پانی بھرے ہوئے ڈول میں دونوں ہاتھ ڈبو کر چڈی پر رگڑ دیئے۔ پھر ماں کے پاس آ کر چلایا۔ "میری ٹوپی کہاں ہے؟"

پھر ٹوپی کی تلاش شروع ہوئی۔ بیچ کا کمرہ، کھانے کا کمرہ سب کچھ چھان مارا، مگر ٹوپی کا کہیں پتہ نہ چلا۔ کافی دیر تک ڈھونڈنے کے بعد ٹوپی ایک بورے کے پیچھے پڑی ہوئی ملی۔ اسے جھٹک کر سر پر چڑھاتا ہوا تختی کو گھٹنوں پر پٹکتا ہوا دینو گھر سے باہر نکلا۔

گھروں کے سایے سایے مدرسے کی اور جاتے ہوئے اس نے حمزہ اور اس کے چھوٹے بھائی عباس کو اسکول جاتے ہوئے دیکھا۔ جھبے دار ٹوپی پر تختی اور کتاب رکھ کر حمزہ ایک ٹانگ پر اچھلتا ہوا چل رہا تھا اور دیوار کے پاس والے تنگ گٹر کے دونوں طرف پیر رکھ کر عباس کودتا ہوا جا رہا تھا۔

بائیں ہاتھ کی دونوں انگلیاں منہ میں ڈال کر دینو نے آہستگی سے سیٹی بجائی۔ اپنے دوست کو پکارنے کا یہ طریقہ سب لڑکوں کو معلوم تھا۔ حمزہ رک گیا اور عباس بھی۔ اتنے میں دینو ان کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے پوچھا۔ "حمزہ تو نے حساب کیا؟" حمزہ نے گردن ہلا کر نہیں کہا۔ اس نے پریشانی سے کہا، "لیکن اگر ماسٹر صاحب مارنے لگیں تو کہہ دوں گا کہ ابا نے بھینس چرانے کے لیے کہا تھا۔"

"میں نے بھی نہیں کیا، چھڑی سے پٹائی ہوگی میری، چھڑی سے۔" بیچ ہی میں عباس تختی بجاتے ہوئے بول اٹھا۔ "ہم کون سا حساب پڑھتے ہیں۔"

www.urduchannel.in

دینو نے اسے ڈانٹا۔ ''اے، تو ابھی پہلی میں ہے، تو حساب کیا جانے خاک؟''

پھر تھوڑی دیر تک تینوں سوچتے رہے۔ عباس کرتے کا کونہ منہ میں ڈالے ہوئے اسے چوسنے لگا، حمزہ اپنی ہتھیلی سے اپنی چپٹی ناک زور زور سے رگڑنے لگا۔ دینو انگلیوں کے ناخن دانتوں سے کترنے لگا۔ بعد میں اچانک دینو اس نتیجے پر پہنچا، ''آج اسکول ہی نہیں جائیں گے۔'' سبھی کو یہ خیال پسند آیا۔ دھت ترے کی! ماسٹر صاحب کی ایسی کی تیسی۔

پھر حمزہ نے عباس کو تاکید کی کہ۔ ''خبردار، گھر پر چغلی کھائی تو'' پھر تینو چپ چاپ نالے کی طرف بڑھے، ببول، املی، کارنجا، برگد وغیرہ پیڑوں کے درمیان سے نالہ بہہ رہا تھا۔ صاف و شفاف پانی، تینوں نے اس کی کلکل کی آواز سنی۔ سیوار، کارنجا، املی کی ملی جلی مہک سونگھی اور کھلے جنگل میں آزاد بچھڑوں کی طرح ریت میں اچھل کود کرنے لگے۔ حمزہ نے کہا، ''تختی کتاب ریت میں گاڑ دو، نہیں تو کہیں کھو جائیں گی۔''

فوراً دینو نے زور زور سے ریت کھود کر گڑھا بنالیا اس میں تختیاں اور کتابیں گاڑ دیں۔ اوپر ریت کا ڈھیر لگا کر اس پر نشانی کے طور پر ایک لمبوترا پتھر گاڑ دیا۔

دوپہر کی دھوپ سارے جنگل میں پھیلی ہوئی تھی۔ کلکل کرتا ہوا نالہ بہہ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پانی میں تیر رہی تھیں۔ کبھی وہ غوطہ لگا کر آگے بڑھ جاتیں اور کبھی اپنی نازک دم ہلاتی ہوئی وہیں ڈٹی رہتیں۔ حمزہ نے پاجامہ اوپر کھونس لیا۔ کرتے کی آستین اوپر کی اور دھار میں گھستے ہوئے وہ بولا۔ ''میں مچھلی پکڑوں گا۔'' دینو اور عباس کنارے کھڑے کھڑے دیکھنے لگے۔

انگوٹھے کی سائز کی ایک مچھلی اتھلے پانی میں آہستہ آہستہ تیر رہی تھی۔ اس کا رنگ ریت کی طرح تھا۔ پیروں کی آہٹ سنبھال کر حمزہ دھیرے دھیرے ایک ایک پیر بڑھانے لگا۔ آہستگی سے نیچے جھکا۔ تتلی پکڑتے وقت ہاتھ جیسے ایک دوسرے میں پھنسا دیتے ہیں ویسے ہی ہاتھ ایک دوسرے میں الجھا کر اس نے آہستہ آہستہ ہاتھ پانی کی سطح سے اوپر نکالے۔ دینو اور عباس سانس روکے کھڑے تھے۔ ماتھے پر بکھرے بالوں کو پیچھے ہٹا کر انھوں نے آنکھوں کو پھیلایا۔

www.urduchannel.in

دھت ترے کی۔اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔

بہاؤ کی طرف اشارہ کر کے دینو چلّایا۔''ارے وہ رہی، آگے بھاگ گئی۔''

وہ چالاک مچھلی ایک پتھر کی آڑ میں چھپ گئی تھی۔ پھر ریتی بھرے ہاتھ کو جھٹک کر حمزہ آگے بڑھا، آہستہ آہستہ پتھر کی طرف جانے لگا۔ مچھلی تک پہنچ بھی گیا۔ پھر اس نے ہاتھوں کو الجھایا اور جھک کر مچھلی کے اوپر آہستگی سے رکھا۔ لیکن اسی دوران وہ مچھلی آگے بڑھ گئی۔ حمزہ دوڑا۔ عباس اور دینو بھی کنارے کنارے اس کے پیچھے دوڑے۔ لیکن اب تک وہ مچھلی پتہ نہیں کہاں غائب ہوگئی تھی۔ حمزہ بولا،''دینو! کائی کے نیچے مچھلیاں چھپی رہتی ہیں۔ کائی کو جھٹکے کے ساتھ اٹھا کر سوکھی ریت پر پٹک دو تو دو چار مچھلیاں وہاں تڑپتی ہوئی ملیں گی۔''

مچھلیوں کے تڑپنے کی ہو بہو اس نے نقل کی۔ عباس کے چہرے پر ہنسی کھل اٹھی۔ لیکن اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے دبا دیا۔

دینو بولا۔''چلو نا عباس، ہم اوپر کی جانب چلیں، کائی وہاں جمع رہتی ہے۔''

گاؤں کا پنگھٹ پار کر کے وہ بہاؤ میں سے بہت دور تک چلے گئے۔ ہری ہری چکنی کائی، پتھروں اور ریت میں اچھلتے کودتے وہ آگے بڑھتے رہے۔ اب تک آٹھ دس بڑی بڑی مچھلیاں حمزہ نے پکڑ لی تھیں۔ مچھلی ہاتھ آتے ہی وہ اسے سوکھی ریت پر کئی بار پٹکتا اور اس سے مچھلی مر جاتی۔ تب کرتے کے اگلے حصے کی گانٹھ مار کر بنائی ہوئی جھولی میں اسے رکھ دیتا۔ اپنے لال لال اور ننھے منے منہ کھولے ہوئے وہ ساری مچھلیاں جھولی میں پڑی رہتیں۔ حمزہ دینو کو سمجھا دیتا، دینو، یہ ہے کالی پیٹھ والی ڈوکری، اور یہ ہے مونچھ والی چھوٹی چنگری، تب دینو اسے چھو کر دیکھتا، مچھلیاں کیسے کھاتے ہو تم لوگ؟

''ابے تجھے کیا معلوم ان کی لذت؟ پہلے ان کا پیٹ چیر کر اندر کی گندگی باہر پھینک دیتے ہیں۔ پھر اوپر کی کھال ادھیڑ کر دور کر دیتے ہیں۔ بعد میں دم اور پر کاٹ کر الگ کرنے پڑتے ہیں۔ تب توے پر بھون کر نمک مرچ لگا کر کھاتے ہیں۔''

دینو کے منہ میں پانی بھر آیا۔ عباس کرتے کی آستین چبانے لگا۔ تھوڑی ہی وقت بعد وہ اس کھیل سے اوب گئے۔ حمزہ نے دینو کی گاندھی ٹوپی پانی میں بھگوئی۔ اس میں سب

www.urduchannel.in

مچھلیاں رکھ دیں اور ٹوپی پاجامے کی ناڑی سے باندھ دی۔

''اب چلو، کانٹے بن میں بٹیروں کے انڈے ڈھونڈنے چلیں۔'' وہ بولا۔

نالے کے ایک طرف کنارے پر ہی یہ کانٹے دار بن عجیب ڈھنگ سے پھیلا ہوا تھا۔ ببول، بیر، بیورو غیرہ کئی قسم کے پیڑ پودے کھڑے ہوئے تھے۔ دیہات کی عورتیں وہاں سوکھی لکڑیاں بٹورنے آتی تھیں۔ لوگ یہاں سے شہد کے چھتے جمع کر کے لے جاتے تھے۔ گوالے بیر جامن کے موسم میں یہاں پھل کھاتے تھے۔

ننگے پیر کانٹوں میں سے راستے بناتے ہوئے یہ تینوں پیڑوں کے جھرمٹ میں گھس گئے۔ تب بیر کے پودوں پر بیٹھی، پر کریدتی ہوئی کوئیلوں نے شور مچایا۔ پروں کے نیچے انڈے لے کر بیٹھی ہوئی بٹیروں نے اپنی گول گول آنکھیں انوکھے انداز سے بند کر لیں اور پھر کھول دیں۔ ببول کے تنے پر بیٹھی سوکھے بیر چکھتی ہوئی ایک گلہری دم اٹھا کر بھاگی اور اوپر کی شاخ پر الٹی چپک کر آوازیں نکالنے لگی۔ تنے کے سوراخ میں بیٹھے ہوئے اس کے بچے ڈر گئے تھے۔

ایک پیڑ کی ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے دینو چلایا۔ ''ارے وہ دیکھ بٹیر کا گھونسلہ!''

حمزہ نے دیکھا اور کہا، ''دینو، وہ گھونسلہ بٹیر کا نہیں، جنگلی چڑیا کا ہے۔ اس کی پیٹھ اینٹ کے رنگ کی ہوتی ہے اور گلے کے نیچے ایک پیلا دھبہ ہوتا ہے۔''

''تم کیسے پہچان لیتے ہو؟''

''یہ کون سی بڑی بات ہے؟ بٹیر کا گھونسلہ چھوٹی ٹہنیوں سے بنتا ہے۔ اور یہ بنا ہے صرف ریشوں سے دیکھنا کیسا ملائم ہے؟''

حمزہ پوری ہوشیاری سے اس گھونسلے کے پاس پہنچا، تنے پر چڑھ کر گھونسلہ نکالنے کے اس نے ہاتھ بڑھا دیا۔ اسی اثناء میں ایک ننھی سی چڑیا اس میں سے پھر سے اڑ گئی اور اوپر کی ٹہنی پر جا بیٹھی۔ اپنی ننھی سی دم ہلاتی ہوئی وہ چہچہانے لگی۔

''حمزہ، کچھ انڈے ہیں اس میں؟'' عباس نے پوچھا۔

''نہیں، نہیں ابھی تو وہ اپنا گھونسلہ تیار کر رہی تھی۔ اس کے تیار ہوتے ہی وہ

www.urduchannel.in

انڈے دے گی۔"

عباس انڈے دیکھنے کے لیے بڑا بے چین ہوگیا تھا۔ حمزہ نے اسے بٹیر کا گھونسلہ دکھادیا۔ بیر کے ایک چھوٹے پیڑ پر تھا وہ ہلکے جامنی رنگ کی بٹیر اس میں بیٹھی تھی۔ "عباس، یہ پٹھانی بٹیر، یہ معمولی بٹیر سے بڑی ہوتی ہے۔" حمزہ نے جانکاری دی۔

اس کے بعد دینو نے نشانہ باندھ کر پتھر مارا۔ وہ پٹھانی بٹیر فوراً اڑ گئی۔ بڑی تکلیف سے دینو اس پیڑ پر چڑھ پایا۔ بیر کے کانٹوں سے اس کے بدن پر کئی خراشیں آ گئی تھیں۔ پھر بھی وہ ڈرا نہیں۔ سوکھی ٹہنیوں سے بنے اس گھونسلے میں انڈے تھے۔ چھوٹے چھوٹے اور سفید دھیرے سے اس نے انھیں نکال لیا وہ اترگیا اترتے ہوئے اس کی قمیض پھٹ گئی۔

عباس نے انڈے کرتے کی جیب میں حفاظت سے رکھ دیے۔ بعد میں تینوں نے خوب مٹر گشتی کی۔ ببول کا سفید، پیلا گوند جمع کیا، حمزہ معلومات کا خزانہ لٹائے جارہا تھا۔ "عباس یہ گوند ہم بنئے کی دکان پر بیچ دیں گے۔ اس کے کچھ پیسے ضرور مل جائیں گے۔"

عباس کرتے کی آستین سے ناک پونچھتے ہوئے بھائی کی ہاں میں ہاں ملائے جارہا تھا۔ پھر بولا۔ "ہم عرس کے دن ان پیسوں سے ایک سیٹی خرید لیں گے یا تل کی ریوڑیاں۔"

جنگل میں بھٹکتے بھٹکتے ایسی کتنی ہی نئی چیزیں دینو نے دیکھیں۔ خوبصورت پرندے، سفید چوہے، ہرے رنگ والے جگمگاتے ہوئے کیڑے، جنھیں پکڑ کر ماچس کی ڈبیا میں اور ببول کے چھوٹے پتے کھلانے سے وہ انڈے دیتے ہیں، شہد کے چھتے.....

چلتے چلتے عباس کے پاؤں میں ایک کانٹا زور سے چبھ گیا تو وہ پاؤں اٹھا کر رونے لگا۔ حمزہ نے اسے نیچے بٹھایا۔ ایک لمبا کانٹا لے کر اندر دھنسے ہوئے کانٹے کو باہر نکالنے کی اس نے کوشش کی، مگر وہ نہیں نکلا۔ پھر اس نے ایک پودا ڈھونڈ نکالا۔ پتہ توڑ کر اس کا سفید دودھ چبھے ہوئے کانٹے کی جگہ پر لگا دیا۔ "عباس، کل صبح کانٹا اپنے آپ باہر نکل آئے گا۔ اب رومت۔" حمزہ نے ہمت بندھائی۔

سورج مغرب میں ڈھل چکا تھا۔ ہوا کی وجہ سے پکی فصل اور کالی مٹی کی سوندھی

www.urduchannel.in

مہک پھیل گئی تھی۔ کانٹے بن کے پرندے شور کر رہے تھے۔ حمزہ بولا، اندھیرا ہو رہا ہے، چلو گھر چلیں۔ جس راستے سے وہ گئے تھے اسی راستے سے لوٹ پڑے۔ عباس کی جیب میں رکھے ہوئے انڈے کب کے پھوٹ چکے تھے۔ ان کے سفید پیلے دھبے کرتے میں لگ گئے تھے۔ انھیں پانی سے اس نے دھوڈالا۔ بھوک لگی تھی۔ اسی لیے حمزہ نے گوند کا ایک گولا ہر ایک کو دیا اور خود بھی کھالیا۔ ذائقے دار گوند سے ان کی زبان لیس دار ہوگئی تھی۔ دانت ایک دوسرے سے چپکنے لگے تھے۔ جب وہ بستی کے پاس پہنچے۔ تب آسمان انار کے پھولوں جیسا لال ہوگیا تھا۔ چراگاہ سے لوٹتی بھیڑ بکریاں، ان کے پیروں سے دھول اڑ رہی تھی۔ ریت میں گڑی ہوئی تختیاں اور کتابیں نکال کر تینوں اپنے اپنے گھر گئے۔ دینو کی ماں قندیل صاف کر رہی تھی۔ دینو کو دیکھتے ہی وہ بولی۔ اتنی دیر کیوں ہوگئی۔ چہرہ اتنا کیوں تمتما رہا ہے؟ دھوپ میں بھٹک رہا تھا کیا؟''

دینو کچھ نہیں بولا، وہ اب بھی اسی کانٹے بن کے خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ پیروں سے پانی اچھال رہا تھا، مچھلیاں پکڑ رہا تھا، بٹیر کے گھونسلے ڈھونڈ رہا تھا۔ گوند جمع کر رہا تھا۔ ماں نے سوچا ماسٹر صاحب نے بچوں کو خوب کھلایا ہوگا، اس لیے دیر ہوگئی۔ اس کا دل اس خیال سے کہ اس کا منا بنا ٹال مٹول کے اسکول جاتا ہے اور پڑھتا ہے۔'' مطمئن ہوگیا۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

ساتھ

مدھو منگیش کرنک

ڈاکٹر۔ انیردھ کو چیک کر رہا تھا اور وہ پلنگ کے کنارے ھتھیلیوں پر سر رکھ کر پاگل کی طرح دیکھ رہی تھی۔ شام کا وقت تھا۔ باہر بارش شروع تھی۔ بے موسم بارش۔ ہوا سے کھڑکیوں کے پٹ بج رہے تھے۔ دیوار پر گلیکسو بے بی کی تصویر والا کلینڈر پھڑ پھڑا رہا تھا۔ مگر اس طرف اس کا دھیان نہیں تھا۔ وہ یکسوئی سے ڈاکٹر کی حرکات اور انیردھ کے چہرے کی جانب یک ٹک دیکھ رہی تھی۔

انیردھ۔ اس کا سات سالہ اکلوتا بیٹا۔ اس کی جھولی میں ڈال کر انیردھ کے والد اس دنیا سے کوچ کر گئے تھے۔ اور گزرے ہوئے سات سال اس نے انیردھ کے سہارے کاٹے تھے۔ جوانی میں بیوگی کے دن

www.urduchannel.in

کا ٹنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ معلّمہ کی نوکری کرتے ہوئے اس نے مشکلات سے بھرے سات سال پیچھے چھوڑ دیئے تھے۔ سدھا کر کے بارے میں یعنی انیردھ کے والد کے بارے میں اس کے دل میں بے شمار یادیں سر ابھارتیں۔ وہ اندر تک دہل جاتی۔ جوانی کا درد بے حال کر دیتا۔ مگر اس نے یہ سب برداشت کرلیا۔ کسی جوگن کی طرح وہ دن گزار رہی تھی۔ سارا سکھ، امیدیں اور مستقبل صرف اور صرف انیردھ کی زندگی کے نام اس نے کر دی تھی۔

اچانک انیردھ بیمار پڑ گیا۔ گرمیوں کی تعطیلات ابھی شروع ہوئی تھی۔ اسکول بند ہوا۔ اس نے انیردھ کے ساتھ چھٹیوں میں بھائی کے گاؤں جانے کی تیاری کی تھی۔ بیگ تیار کیا تھا۔ اب ڈیڑھ مہینہ تک واپس نہیں آنا ہے، یہ سوچ کر انیردھ کے کھلونے بھی ساتھ لیے تھے۔ گاڑی کی ٹکٹیں بھی نکال رکھی تھیں اور کل صبح روانگی سے پیش تر ہی شام میں انیردھ کو بخار چڑھ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اسے سفر نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

سدھا کر کے انتقال کے بعد سے آج تک بیماری گھر میں داخل نہیں ہو سکی تھی۔ سدھا کر گیا اس وقت سے وہ سب کچھ برداشت کرنا سیکھ چکی تھی۔ سارے ذہنی انتشار کے باوجود جسمانی طور پر وہ بہتر تھی۔ اسی لیے وہ اس بیماری کی وجہ سے پریشان ہو گئی تھی۔ انیردھ کے پاس وہ چھ سات دن سے لگاتار بیٹھی ہوئی تھی۔ بخار اپنے عروج پر تھا اور آج کی رات گزر جانے کے بعد کل سے سب نارمل ہونے والا تھا۔ ایسی ڈاکٹر کی رائے تھی۔

ڈاکٹر نے اسٹیتھسکوپ نکالا اور اسے گلے میں لٹکا دیا۔ پھر کہا۔ ''رات بھر جاگنا ضروری ہے۔ ہر ایک گھنٹے پر ٹمپریچر کا اندراج چاہئے۔ میں جو کہوں وہ دوائیاں وقت پر دی جانی چاہئیں۔''

''میں جاگوں گی، میں سب کچھ کروں گی۔'' اس نے بے صبری سے کہا۔ ''بس بچے کا بخار اتر جائے۔ آپ جو کہیں میں ساری مصیبتیں جھیلنے کے لیے تیار ہوں۔''

''مگر کس طرح ممکن ہے؟ تم اکیلی ہو۔ ایک ہفتے سے میں دیکھ رہا ہوں آرام نہ کرتے ہوئے رات دن تم نے بچے کی دیکھ ریکھ کی۔ میری بات مانیئے۔ کسی کو بلوا لیجئے۔ رات بھر جاگنا تمہارے لیے ممکن نہیں۔''

www.urduchannel.in

''کوئی فکر مت کیجئے ڈاکٹر۔ میں رات بھر جاگوں گی۔''

''ایسا نہیں، آئی مین..... بچے کی ساری کنڈیشن ذہن نشین کر لیجئے۔ اس لیے کسی کو ساتھ رکھئے۔ رات بھر کے لیے۔ سمجھئے، رات میں ہی مجھے بلانا پڑے.....''

ڈاکٹر سنجیدگی سے ایک ایک لفظ بول رہا تھا۔ اور اس کے لفظوں کے ساتھ ساتھ اس کے دل پر فکروں کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ ایسی خطرناک حالت ہے انیردھ کی! مگر کسے بلوایا جائے!

''پڑوس میں کوئی عورت یا نوکرانی ہوگی تو دیکھئے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

فکروں میں ڈوبا چہرہ ڈاکٹر نے دیکھا تھا۔ اس لیے اس نے ہمت بڑھانے کے لیے کہا تھا۔ ''یہاں کوئی بھی نہیں ہے جسے بلایا جا سکے۔'' سچ ہے۔ یہاں کون آ سکتا تھا۔ گاؤں سے باہر، کالونی میں، اتنی دور، رات میں۔ گاؤں میں اس کا کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔ اور کالونی میں جو اسٹاف والے تھے وہ سبھی چھٹیوں کے شروع ہوتے ہی چلے گئے تھے۔ پوری کالونی میں وہی رہ گئی تھی۔

ڈاکٹر کو بھی کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ گھر کے باہر آ کر ڈاکٹر نے کہا۔ ''اچھا، آتا ہوں میں۔''

اور وہ اکیلی رہ گئی۔ پلنگ پر انیردھ کراہ رہا تھا۔ باہر اس کا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ دیوار پر اس کے بخار کا چارٹ لٹکا ہوا تھا۔ اسٹول پر دوائیوں کی بوتلیں تھیں۔ پلنگ کے نیچے بیڈ پین اور طشت رکھا ہوا تھا۔ ہر طرف بیماری کی نشانیاں تھیں۔ اور وہ خالی ذہن سے انھیں دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد دروازہ بند کرنے کا ہوش بھی اسے نہیں تھا۔ دل میں ایک خیال تھا۔ یہ رات کس طرح گزرے! ڈاکٹر نے جو کچھ کہا تھا، غلط نہیں تھا۔ ایک ہفتے تک آرام نہ کرنے کی وجہ سے اسے اگر نیند آ گئی تو؟ ڈاکٹر نے کہا تھا۔ ''ڈوز وقت پر دینا چاہئے۔'' آنکھوں میں تیل ڈال کر آج کی رات پہرہ دینا چاہئے۔ کل سے اس کی طبیعت میں سدھار ہونے والا تھا۔ ایک رات اسے سنبھالنا ضروری تھا۔

وہ تھکی ماندی بیٹھی تھی۔ اندر روم میں جا کر تھوڑے سے چاول ہی بنا لے اس کے

www.urduchannel.in

لیے بھی وہ تیار نہ تھی۔ بس اسی جگہ بیٹھ کر ساری رات گزارنی ہے۔ مگر دوسرے ہی پل دل میں خیال آیا رات میں بخار چڑھ گیا اور ڈاکٹر کو بلوانا پڑے تب؟ کون جائے گا اتنی دور رات میں؟ اس گاؤں میں نہ فون.....اور نہ کوئی سہولت۔

اسے ایسا محسوس ہوا جیسے بدن کی ساری قوت ختم ہوگئی ہو۔ وہ کھڑکی کے پاس آ گئی۔ اور باہر دیکھنے لگی۔ چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا چل رہی تھی اور بارش تھم گئی تھی۔ اس نے سوچا کھڑکیاں اور دروازے بند کر دوں تبھی سامنے کے راستے پر ٹارچ کی روشنی جگمگائی۔ کوئی کالونی کی طرف آ رہا تھا۔ وہ تجسس سے دیکھ رہی تھی اور یہ دیکھ کر کہ ٹارچ لے کر آنے والا شخص اپنے ہی گھر کی جانب آ رہا ہے اسے اطمینان ہوگیا۔ اس وقت کون آ سکتا ہے؟ کہیں ڈاکٹر نے تو کسی کو نہیں بھیجا؟

زینے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ایک اونچا پورا جوان اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سفر والا بیگ تھا۔ وہ اسے پہچان نہ سکی۔ اس وقت جوان نے تعارف پیش کیا۔ ''میں دلیپ انعامدار.....پہچانا نہیں تم نے مجھے؟''

اس نے اسے پہچان لیا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''واہ، میں کیسے بھول سکتی ہوں؟'' یہ کہتے ہوئے اس نے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

''مگر تم کتنے سال بعد مل رہے ہو.....اور اچانک.....''

''اچانک ہی سہی۔'' دلیپ نے کہا۔

وہ تھوڑا رکی۔ اندر کے روم میں جاتے جاتے پل بھر کے لیے پیچھے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ آرام سے نیچے جھک کر جوتے کے بند کھول رہا تھا۔ وہ اندر گئی.....

میرے بولنے کی وجہ سے اسے دکھ تو نہیں ہوا! پھر کیوں اس نے میرے لفظ دہرائے۔ وہ اطلاع دے کر نہیں آیا۔ اچانک ہی آیا۔ بالکل درست ہے۔ مجھ سے کہاں غلطی ہوئی۔ اب کہاں اس سے کوئی تعلق تھا۔ وہ سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔ پہلے اس کے علاوہ ذہن میں کون تھا۔ مگر اب کیا کیا جا سکتا ہے۔ دس سال پہلے کی وہ پرانی باتیں۔ اس کے بعد دل میں کتنے ہی طوفان اٹھے۔ سیلاب آئے۔ دلیپ انعام دار اس نام کی کوئی نشانی بھی باقی نہیں تھی

www.urduchannel.in

اب۔ پھر دل و دماغ میں رہنے کی وجہ کیا؟

وہ باہر آئی۔ وہ دیوار سے قریب ایک کرسی پر مہمان کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ وہ انیرودھ کے پلنگ کے پاس والی کرسی پر بیٹھ کر اسے دیکھنے لگی..... بالکل دس سال پہلے جیسے تھا ویسا ہی آج بھی ہے۔ دل بھی ویسا ہی ہوگا.....؟

''آفس کے کام کے سلسلے میں پونا جا رہا تھا۔ اس اسٹیشن پر گاڑی بدلنا پڑتی ہے۔ اگلی گاڑی کے لئے ابھی تین چار گھنٹے باقی ہیں۔ پھر تمہاری یاد آگئی۔ تم یہاں رہتی ہو۔ اور پتہ ڈھونڈتے ہوئے آگیا۔ سوچا مل کر جاؤں'' وہ بول رہا تھا۔

وہ سن رہی تھی۔ آج بھی وہ اسی طرح بولتا ہے۔ منہ پر ہاتھ پھیر کر۔ گردن جھکا کر اور درمیان میں لفظ توڑ کر..... آج بھی ویسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ بال تھوڑے اڑ گئے۔ باقی دس سال پہلے کی شخصیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اور اسے اچانک محسوس ہوا کہ اس کی نگاہیں بھی اس پر مرکوز ہیں! کون سے جذبات ہیں اس طرح کی نظروں میں؟ اور اسے خود سے ہی خوف آگیا۔ میں کیوں اس کی جانب یک ٹک دیکھ رہی ہوں۔ یادیں سر ابھار رہی ہیں۔ اب کیوں چاہئے یہ.....؟ پلنگ پر سوئے ہوئے انیرودھ نے ہاتھ پیر ہلائے۔ اس نے کراہتے ہوئے کروٹ بدلی۔ وہ فوراً اٹھی اور چادر ٹھیک کرتے ہوئے بخار دیکھا۔

''تیرا..... تمہارا بیٹا ہے کیا؟ بیمار ہے؟''

اس نے کچھ نہیں کہا۔ گھڑی میں دیکھ کر بوتل سے گلاس میں ڈوز نکالا اور انیرودھ کو جگا کر دوا پلانے لگی۔

دلیپ کرسی پر بیٹھے بیٹھے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ دل میں سوچ رہا تھا یہ بول نہیں رہی ہے؟ شاید یہ سب کچھ بھول گئی ہے۔ دس سال کے عرصے میں انسان اتنا بدل جاتا ہے؟ پھر میں کیوں نہیں بدلا؟ دس سال کے بعد بھی اسے میں بھول نہیں پایا۔ اس گاؤں کا اسٹیشن آتے ہی سب سے پہلے اسی کی یاد کیوں آئی؟ اسے میرے بارے میں کچھ محسوس نہیں ہوتا ہوگا؟ دل و دماغ میں نہ رہتے ہوئے آگئے..... ایسا کیوں کہا؟ کیا ہونے والا ہے ان تین چار گھنٹوں میں؟ اس نے گھڑی دیکھی۔ رات کے نو بجنے والے تھے۔ رات میں ایک بجے اسے

www.urduchannel.in

دوسری گاڑی تھی۔ اس وقت تک یہاں وقت کاٹا جائے؟ بات چیت کرتے ہوئے، پرانی یادوں کے اوراق الٹتے ہوئے۔ اب اس میں اسے مزہ آئے گا کیا؟ یا پھر شوہر کی یادوں میں ہی ابھی تک اس کا دل اٹکا ہوا ہوگا؟ اسے لگا اسی وقت یہاں سے چلا جاؤں؟ اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں رات گزاروں۔ ایسا خیال اس کے دماغ میں آیا۔

انیردھ کو دوا دے کر وہ اٹھی اور اس کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی۔ ساڑی کے پلو سے گلے کا پسینہ پونچھتے ہوئے بولی۔ ''اچھا ہوا تم آ گئے۔ مجھے کسی کے ساتھ کی بہت ضرورت تھی۔''

دلیپ سن رہا تھا اور قریب سے اس کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ دس سال میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی۔ چار سال گرہستی چلی۔ لڑکا ہوا اور پچھلے چھ سال بیوگی میں گزرے۔ ایسے حالات میں کوئی دوسری عورت ہوتی تو کافی بدل جاتی۔

''ابھی تمہارے آنے سے پہلے میں کشمکش میں مبتلا تھی کہ کسے بلایا جائے، کالونی میں کوئی نہیں۔''

اس کی باتیں سن کر دلیپ کے دل میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ شریانوں میں خون کا دوران بڑھ گیا تھا۔ یہ سب کچھ اسے کیوں بتا رہی ہے؟

''تمہاری گاڑی کتنے بجے ہے؟''

''رات میں ایک بجے۔''

''اس کے بعد کون سی؟''

''صبح آٹھ بجے کی۔''

''اگر صبح کی گاڑی سے جاؤ گے تو نہیں چلے گا کیا؟'' اس نے پہلی بار اس کی طرف نظر اٹھا کر کہا۔ اس کی نظر، اس کی نگاہوں سے ٹکرا گئی۔ وہ ذرا گھبرا گیا۔ پھر اس کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر کہا۔ ''چلے گا۔''

اس کے بدن میں ایک نئی قوت دوڑ گئی۔ وہ کرسی سے اٹھی اور اندر کے روم میں جاتے جاتے کہا۔ ''وہاں باتھ روم ہے۔ کپڑے اتار کر آرام سے منہ ہاتھ دھولو۔ میں جب

www.urduchannel.in

تک کھانے کا انتظام کرتی ہوں۔"

کھانے کا سنتے ہی اس کی بھوک میں اضافہ ہوگیا۔اسے پرانی باتیں یاد آگئیں۔اس کی ریسیڈنسی پر وہ ایک بار ہمت کر کے آئی تھی۔اسے اور اس کے روم پارٹنر کو اس نے اپنے ہاتھوں سے کھانا بنا کر کھلایا تھا۔کئی سال پہلے کا یہ واقعہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔وہ اندر گئی۔اور وہ ٹھنڈے پانی سے منہ ہاتھ دھونے لگا۔ایک غیر یقینی خوشی اس کے ہاتھ آگئی تھی۔گزرتی ہوئی رات کے ساتھ ساتھ اس کے دل و دماغ پر نشہ چھانے لگا تھا۔فریش ہو کر اس نے نائٹ ڈریس زیب تن کیا۔سگریٹ کے مرغولے چھوڑتے باہر آیا۔پھر اور باہر آئی اور کہا "چلئے کھانا لگاتی ہوں۔""تم نہیں کھاؤ گی؟""آج میرا روزہ ہے"۔وہ بجھی ہوئی سگریٹ کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔اس نے کھانا شروع کیا۔وہ بازو میں بیٹھ گئی۔باہر سے انیردھ کی کراہنے کی آواز آئی۔وہ فوراً اٹھ گئی۔اس نے بخار چیک کیا۔چارٹ پر لکھا اسے پانی پلایا۔گولی کھلائی۔دلیپ کو کھانا دینے کے لئے اندر آئی۔وہ اپنے میں ہی کھویا ہوا تھا۔پرانی یادیں رہ رہ کر سر ابھار رہی تھیں۔وہ بھی پرانی باتوں میں اس کا ساتھ دے رہی تھی مگر بیچ بیچ میں اٹھ کر باہر جا رہی تھی۔بیٹے کو دیکھ کر پھر آ رہی تھی۔ادھوری باتیں جوڑ کر دوبارہ اس کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔مگر اس کا ذہن بیٹے کی طرف زیادہ لگا ہوا تھا۔یہ بات اس کے دماغ میں آگئی۔مگر اس کا احساس اس نے ہونے نہ دیا۔وہ ہنستا بولتا رہا۔اسے کھل کر باتیں کرنے کے لئے اکساتا رہا۔کھانے کے بعد اس نے تولیا دیا۔تولیہ لیتے ہوئے دلیپ نے اس کا ہاتھ چھویا۔اس لمس کا احساس کرتے ہوئے وہ باہر آ کر بیٹھ گئی۔رات من مطابق چڑھ رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ باہر آئی۔دلیپ نے سگریٹ بجھائی۔اب بے تکلف ہو کر بات چیت کریں گے یہ سوچتے ہوئے وہ اٹھا۔تبھی اس نے کہا۔"دیکھو گیارہ بج گئے.....اب تم زیادہ مت جاگو۔صبح جلدی اٹھ کر تمہیں واپس جانا ہے نا؟تمہارا بستر اندر کے روم میں لگا دیا.....مچھر دانی چاہئے تمہیں؟یہاں مچھر نہیں اسی لئے.....مگر.....!"

وہ بغور اسے دیکھتا رہا۔مگر اس کی نظر پلنگ پر سوئے انیردھ کی طرف لگی تھی۔

www.urduchannel.in

''چلو تمہیں بستر دکھادوں.....'' اس نے کہا اور مجبوراً اس کے پیچھے پیچھے دلیپ کو جانا پڑا۔ دلیپ کے روم میں داخل ہوتے ہی اس نے درمیانی دروازے میں کھڑے ہو کر کہا ''کونے میں پانی سے بھرا ہوا تانبے کا لوٹا رکھا ہوا ہے۔ اور ہاں، رات میں اگر مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑے تو میں تمہیں اٹھاؤں گی..... نہیں تو صبح تک آرام سے سو جاؤ''۔

اور اس نے دروازہ بند کیا۔ باہر سے چٹخنی چڑھائی۔ انیردھ کے پاس کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے بدن کا سارا انتشار ختم ہو گیا ہے۔ روح کی گہرائیوں میں کہیں نہ کہیں سے کچھ یادیں، باتیں ابھر آتی ہیں۔ اسے محسوس ہوا۔ وہ خاموشی سے انیردھ کے جلتے ہوئے بدن پر ہاتھ پھیرنے لگی.....!!

☆☆☆

www.urduchannel.in

فساد

ارون سادھو

باندرہ کی بھٹار چال کی دوسری منزل۔ مہتا جی کا چار سال کا بیٹا ہرشد دوپہر کے کھانے کے بعد قمیض سے اپنا منہ صاف کرتے ہوئے باہر نکلا تو دیکھا کہ صدیقی صاحب کی پانچ سال کی بیٹی زبیدہ پینسل سے گیلری کی دیوار پر کوئی تصویر بنا رہی ہے۔

"زبیدہ، آ، چل ہم موٹر موٹر کھیلیں گے۔" ہرشد نے اس کی مصوری کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"چل ہٹ! میں تو تصویر بنا رہی ہوں۔" زبیدہ نے گردن اٹھائے بغیر اکڑ کر جواب دیا۔

کچھ دیر تک ہرشد اسے دیکھتا رہا۔ پھر پوچھا "کس کی تصویر بنا رہی ہو تم؟"

"اپنے ابا کی"

www.urduchannel.in

ہرشد نے پھر ایک بار منہ صاف کیا۔ آگے سے لٹکی ہوئی قمیض پینٹ میں ڈالی۔ پھر ہتھیلی سے ہوائی اسٹیرنگ پکڑ کر منہ سے ''بھر.....بھر'' کی آواز نکال کر گاڑی چلانا شروع کر دیا۔ پھر چلا کر بولا۔ ''زبیدہ دیکھ میری گاڑی چرچ گیٹ، وی۔ ٹی جا رہی ہے۔ دادر بھی جائے گی.....تو چلے گی!''

اب زبیدہ سے رہا نہ گیا۔ ''دادر بھی جائے گی! تو پھر چلو۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ہرشد کی قمیض کا پچھلا سرا پکڑا اور منہ سے اسٹارٹ کی آواز نکالی۔ ہرشد نے بس کا ہارن بجایا۔ زبیدہ سے پانچ روپے لے کر اسے پانچ روپے کا ٹکٹ تھمایا، مزید ایک دو فرضی مسافر لیے اور اس کی بس آگے چل پڑی۔ گورے گاؤں، ملنڈ، اندھیری، دادر، کلیان سے ہو کر بس چرچ گیٹ پہنچ گئی۔ واپسی میں ہرشد اور زبیدہ نے اپنی اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ پھر ہرشد مسافر بن گیا اور زبیدہ ڈرائیور۔ بس نے لمبی گیلری کے تین چار چکر کاٹے اور ایک موڑ پر بس سچ مچ حادثے حادثے کا شکار ہو گئی۔ سیڑھیوں کے اوپر زور سے کھینچنے کی وجہ سے ہرشد پھسل گیا اور پہلی تین چار سیڑھیاں لڑھکتا چلا گیا۔ اور پھر شور مچ گیا۔ ہرشد کی چیخ جب شریمتی مادھوری مہتا نے سنی تب وہ دوپہر میں حسب معمول ستا رہی تھیں۔ آرام میں خلل پڑنے کی وجہ سے وہ دندنا اٹھیں۔ اس نے ہرشد کو باہر بھیجتے وقت کہا تھا کہ اوپر جا کر زبیدہ کے ساتھ مت کھیلنا اگر کھیلو تو لڑنا مت۔

''کیا؟.....کیا ہوا؟'' اس طرح بڑبڑاتی ہوئی وہ باہر نکلیں تو دیکھا کہ زبیدہ کی امّی ہرشد کو گود میں اٹھا کر اوپر لا رہی تھیں۔ اس کی ٹھوڑی پر ہلکا زخم تھا اور تھوڑا سا خون بھی نکل آیا تھا۔

مادھوری نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ہرشد کو جھٹکے سے کھینچ لیا اور اس کی پیٹھ پر ایک گھونسا جماتے ہوئے بولیں۔ ''کہاں گیا تھا؟ ہزار بار کہا ہے تجھ سے دوپہر میں اس کے ساتھ مت کھیلا کر.....اس کے بعد پھر سے جا کر تو دیکھ.....''

زبیدہ کی امّی بھی اس بات کا برا مان گئیں۔ ''کیوں مار رہی ہیں بچے کو؟ بچے تو کھیلیں گے ہی اور گریں گے بھی۔''

''ماروں گی! میرے بچے کے ساتھ جو جی چاہے کروں گی۔ تم اپنی بیٹی کو سنبھالو۔''

www.urduchannel.in

زبیدہ کی امّی کا ماتھا ٹھنکا۔ ''میری بیٹی نے کیا کیا ہے؟ بیٹی کو سنبھالو کہتی ہے۔ دونوں کھیل رہے تھے۔ یہ گر گیا۔ اس نے کیا کیا؟''

''وہی تو مارتی رہتی ہے ہر شد کو ہر گھڑی۔ اتنی بڑی ہو گئی ہے ابھی تک اسکول میں داخل تک نہیں کیا۔ دن بھر دھما چوکڑی مچاتی رہتی ہے۔ کسی کو ذرا آرام تک کرنے نہیں دیتی۔'' مادھوری نے غصّے سے کہا۔

اونچی آوازیں سن کر اوپر کی منزلوں کے دسوں دروازے کھل گئے۔ کیا معاملہ ہے؟ یہ دیکھنے کے لیے عورتیں باہر آ گئیں۔ امّی کہہ رہی تھیں۔ ''میں اپنی بچّی کو اسکول میں ڈالوں یا گھر پر رکھوں، اس سے تمہیں مطلب؟ تم خود اپنے بچّے اور شوہر کو سنبھالو۔''

اس بات سے مادھوری کو بڑی تکلیف پہنچی۔ ویسے تو محی الدین صدیقی اور کمل مہتا رمی جمانے والے دوست تھے۔ مہتا تھوڑی بہت پیتا بھی تھا اور زبیدہ کی امّی کو شک تھا کہ اسی نے یہ عادت صدیقی کو لگائی ہے۔ تب ہی سے ان دونوں کی رمی دونوں عورتوں کو کھل رہی تھی۔

بات اسی طرح بڑھتی گئی۔ دونوں طرف سے عورتوں نے ایک دوسرے کو مخصوص زنانہ گالیاں دے ڈالیں۔ ہاتھا پائی تک نوبت آ گئی تو دیگر پڑوسیوں نے بیچ بچاؤ کر کے انھیں روک دیا۔ مادھوری اور امّی روتے دھوتے اور بچّوں کو پیٹتے ہوئے اپنے اپنے گھروں میں لوٹ گئیں۔

اس روز کمل کے دفتر میں کام کچھ زیادہ ہی تھا۔ اس وجہ سے اسے گھر آتے آتے رات کے دس بج گئے۔ واپسی میں کسی دوست کے یہاں رکا بھی تھا اور وہیں اس نے تھوڑی سی پی لی تھی۔ گھر آیا تو بیٹے کا منہ پھولا ہوا تھا۔ بیوی روٹھی ہوئی تھی۔ پہلے ہی دفتر میں اس کی باس کے ساتھ بحث و تکرار ہوئی تھی اور گھر میں دوسرا ہی تماشا تھا۔ بیوی کے ذرا سا مرچ مسالہ لگانے پر ہی غصّہ آ گیا۔ دھڑام سے دروازہ کھولا اور باہر نکلا۔ ''کیا ہے بے صدیقی؟ سالے! شراب پینا کیا میں نے سکھایا ہے تجھے؟'' یہ کہتے ہوئے سیدھا صدیقی کے گھر کے پاس آیا اور اس کے بند دروازے پر زور سے لات ماری۔ یہ دیکھ کر مادھوری گھبرا گئی۔ ''ابے صدیقی، چل باہر آ! سالے..... تجھے شراب پینا کس نے سکھایا؟''

www.urduchannel.in

اس منزل کے سارے کرایہ دار جاگ گئے۔ صدیقی دوپہر میں ہوئے ہنگامے کے بارے میں انجان تھا۔ وہ تھکا ماندہ بستر پر لیٹا تھا۔ دن بھر اسے دکان میں کھڑے رہنا پڑتا تھا۔ آج اس کے ہاتھ سے ایک قیمتی کانچ کی پلیٹ ٹوٹ گئی تھی۔ مالک نے کچھ کہا تو نہیں تھا، لیکن یہ ظاہر تھا کہ اس کی تنخواہ سے پیسے کاٹے جائیں گے۔ اس وجہ سے وہ بھی پریشان تھا۔

مہتا کی لات دروازے پر پڑتے ہی ہڑبڑا کر وہ باہر آ گیا۔ مہتا نے پی رکھی ہے۔ یہ وہ شراب کی بو سے ہی جان گیا تھا۔ مہتا کی آنکھیں سلگ رہی تھیں۔ ''سالے..... بیوی کو کیا بتایا؟ کیا میں نے تجھے پینا سکھایا۔''

''جانے دو یار! یہ وقت نہیں ہے بات کرنے کا..... کل بات کرلیں گے۔'' صدیقی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''کل ول کچھ نہیں۔ ابھی بتا۔'' مہتا نے اس کی کلائی پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا۔

صدیقی اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے اسے کمرے تک لے گیا اور دھیمی آواز میں کہنے لگا۔ ''یار تو نے پی رکھی ہے۔ کیوں بے کار بک بک کر رہا ہے، سارے چال والے دیکھ رہے ہیں۔''

''کون کہتا ہے میں نے پی رکھی ہے؟'' خود کو چھڑاتے ہوئے، مہتا نے گرجتے ہوئے کہا۔

اب تک اوپر سے نیچے چال کے سبھی کرایہ دار جاگ گئے تھے۔ اتنا ہی نہیں آس پاس کی کھڑکیاں بھی کھل گئی تھیں۔

مہتا اونچی آواز میں بولے جا رہا تھا۔ ''کس کا باپ کہتا ہے کہ میں نے پی ہے؟ سالے آؤ ایک ایک کو ٹھنڈا کر دوں گا۔''

دو چار بار باپ کا حوالہ سن کر صدیقی نے اس کے گال پر تھپڑ رسید کر دیا اور اسی کے ساتھ دونوں میں ہاتھا پائی کی شروعات ہوگئی۔ مادھوری اور امّی کی چیخوں سے پورا ماحول گونج اٹھا۔ شور بڑھتا گیا۔ ایک ہنگامہ سا کھڑا ہو گیا۔ مار پیٹ تو زیادہ سے زیادہ دس بارہ سیکنڈ کے لیے ہوئی۔ دونوں کو آس پاس کے لوگوں نے الگ کر دیا۔ دونوں کی ناک سے خون بہہ

www.urduchannel.in

رہا تھا۔ انھیں ان کے کمروں مین پہنچایا گیا۔

لیکن چال سے تھوڑی ہی دور پولس اسٹیشن تک آواز پہنچ گئی تھی۔ وہاں کا چوکس تھانے دار تاوڑے ہانپتا ہوا پہنچا۔ تب لوگوں نے مہتا اور صدیقی کو اپنے اپنے گھروں میں پہنچا دیا تھا اور لوگ الگ الگ گروہوں کی شکل میں اپنے اپنے گھر لوٹ رہے تھے۔

''کیا بات ہے؟'' تاوڑے نے نیچے کی منزل والوں سے پوچھا۔

''کچھ نہیں معمولی بات تھی۔ اب سب ٹھیک ہوگیا ہے۔'' لوگوں نے کہا بھی لیکن وہ بھی بڑا ایماندار تھانیدار تھا۔ اس نے ٹھیک ڈھنگ سے پوچھ تاچھ کی۔ ''جھگڑا کہاں ہوا؟ کیوں ہوا؟ کس کس کو چوٹیں آئیں؟'' وغیرہ وغیرہ۔ پھر دوسری منزل پر جا کر اس نے جانچ کی۔ پولس کے آنے کی بات سنتے ہی چال کے لوگ گھبرا گئے۔

''اجی ایسا ویسا کچھ نہیں ہے..... بس ذرا سی کہا سنی ہوگئی تھی دونوں میں۔''

''لیکن مار دھاڑ ہوئی ہے تو صاحب کو رپورٹ تو دینی ہوگی نا!'' یہ کہتے ہوئے تاوڑے نے دونوں کے نام لکھے۔ ہمیں ایک دوسرے کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہے۔ مہتا اور صدیقی کے ذریعے وضاحت کرنے کے باوجود اس نے اپنی جانچ پوری کی۔ دونوں کے دستخط لیے اور چال والوں سے اجازت لے کر تھانے لوٹ گیا۔

ادھر روزنامہ ''گوندھل'' (ہنگامہ) کے دفتر میں ایک صحافی سدانند مسکوٹے ٹیبل پر پیر رکھے سگریٹ پیتا ہوا استار ہا تھا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ اب دو چار سگریٹیں پی کر پولس فائر بریگیڈ چیک کر کے رات کو گھر لوٹنے کا اس کا ارادہ تھا۔ آج کوئی خاص کام نہ ہونے کی وجہ سے وہ خوش تھا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ ''ہیلو..... کون مسکوٹے؟'' اس کے ایڈیٹر کا فون تھا۔

''جی ہاں..... سر!''

''تم ابھی ہو نا؟ مجھے لگا جا چکے ہوگے..... اچھا، ایک کام کرو۔ وہ باندرہ کی نشاط کالونی ہے نا۔ وہاں پر کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔ وہاں میرا بہنوئی رہتا ہے۔ میری بہن آج یہاں آئی ہے۔ وہی کہہ رہی تھی..... اور سنو پاس ہی میں جو بھٹار چال ہے اس میں خون خرابہ ہوا

www.urduchannel.in

ہے.....لوگ کافی اکٹھا ہوئے تھے ہوسکتا ہے کوئی دنگا فساد ہوا ہو۔ پوچھ تاچھ کر کے دیکھنا اور مجھے بتانا کہ معاملہ کیا ہے۔''

''کہاں؟.....بھٹار چال.....باندرہ؟ میں جا کر دیکھتا ہوں۔''

''دیکھنا کوئی خبر ہو تو۔ ہم سے کہیں چھوٹ نہ جائے۔ اسی لیے مجھے فون کرنا پڑا'' یہ کہہ کر ایڈیٹر نے فون رکھ دیا۔

مسکوٹے نے پہلے پولس اسٹیشن کنٹرول روم فون کیا۔ وہاں کچھ پتا نہ چلا۔ پھر باندرہ پولس اسٹیشن فون کیا۔

''کچھ گڑبڑ ہے تو سہی لیکن پوری طرح پتا نہیں چل سکا۔ آپ کنٹرول روم سے پتا کریں۔'' مسکوٹے کو جواب ملا۔

اس نے چڑھ کر دوبارہ کنٹرول روم کو فون کیا۔ 'اجی صاحب، بات کچھ خاص نہیں ہے'' اسے سوکھا سا جواب ملا۔

''کچھ کیسے نہیں؟ لوگ کہہ رہے ہیں کچھ تو ہوا ہی ہے اور ادھر کنٹرول روم کو پتا نہیں ہے؟ پھر تو ہمیں کمشنر صاحب کو ہی فون کرنا ہوگا۔'' اس نے کنٹرول روم کو خوب ڈانٹ پھٹکار سنائی۔

پولس کمشنر کا نام سن کر کنٹرول روم کا ڈیوٹی آفیسر گھبرایا کہنے لگا۔ ''بات یہ ہے صاحب کہ ہر چھوٹی بڑی بات کی پورٹ فوراً تو ہمیں ملتی نہیں ہے۔ اب اگر آپ جانکاری چاہتے ہیں تو دس پندرہ منٹ میں پوچھ تاچھ کر کے آپ کو فون کرتا ہوں۔''

پولس نے کنٹرول روم سے باندرہ اور وہاں سے فوراً تھانے فون کیا۔ تاوڑے نے فون اٹھایا۔ ''وہاں کچھ گڑبڑ ہوئی دس ساڑھے دس بجے؟''

''کوئی گڑبڑ نہیں ہے صاحب۔'' تاوڑے نے جواب دیا۔

''ارے کیا گڑبڑ نہیں! کچھ کام کرتے بھی ہو یا نہیں؟ باہر کے لوگوں سے فون پر پتا چلتا ہے کہ بھٹار چال میں گڑبڑ ہوئی ہے اور تم لوگ سوئے پڑے ہو۔''

''بھٹار چال میں؟ میں وہاں گیا تھا صاحب! کوئی خاص بات نہیں۔'' پھر تاوڑے

www.urduchannel.in

نے مرچ مسالہ لگا کر اپنی رپورٹ دی۔

''شکایت نہیں ہے کسی کی؟''

''بالکل نہیں صاحب! یہ تو آپسی جھگڑا تھا۔''

''پورا بندوبست ہے نا؟''

''جی صاحب!''

''اور سنو، ان دونوں کے نام کسی کو بھی مت بتانا۔ پریس کے لوگ فون کریں گے تو انھیں مجھ سے ہی بات کرنے دینا۔''

''جی صاحب!''

پندرہ منٹ بعد کنٹرول روم کے فون کی گھنٹی پھر بجی۔ ''لو مسکوٹے صاحب! ہم نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ کوئی معاملہ نہیں؟ دو آدمیوں کے بیچ کہا سنی ہوئی تھی اور پھر معاملہ نپٹ گیا۔''

''لیکن کافی شور غل مچا تھا۔''

''مار اماری کے بعد شور شرابہ تو ہوگا ہی۔ لیکن گرفتار کسی کو بھی نہیں کیا گیا۔''

مسکوٹے ویسے بات کو یہیں ختم کر دیتا لیکن آج اسے اس پر کچھ لکھنا ہی تھا۔ ایڈیٹر کا حکم تھا۔ اس لیے اس نے پوچھا۔ ''ٹھیک ہے، مار اماری کرنے والوں کے نام بتاؤ۔''

''جب بات کچھ ہوئی نہیں اور جھگڑا بھی ختم ہو گیا تب نام کی کیا ضرورت ہے صاحب؟''

''ڈیوٹی آفیسر نام بتانے میں ٹال مٹول کرنے لگا کیوں کہ ایک نام تھا محی الدین صدیقی اور دوسرا نام تھا کملی مہتا۔'' اس طرح کے معاملات میں پریس کو نام نہ دینے کی سخت ہدایت تھی۔

''سمجھ گیا میں۔ دو جماعتوں کے نام ہوں گے!''

''ایسا ہی کچھ سمجھ لیجئے۔ لیکن اب امن وچین ہے۔''

''بندوبست؟''

www.urduchannel.in

''ہے، چار پانچ پولس والے! لیکن یہ تو خبر شائع ہونے کے لائق نہیں ہے صاحب!''

''اچھا! شکریہ۔'' کہہ کر فون رکھتے ہوئے مسکوٹے بھانپ گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ مسکوٹے نے سوچا، بھٹار چال میں اس وقت بڑا تناؤ ہے لیکن فورٹ سے وہاں آنے جانے میں ہی تین گھنٹے لگ جائیں گے۔ ایسی حالت میں آج خبر نہیں جا پائے گی۔ اس لیے آخر میں ایک اور سگریٹ پھونک کر مسکوٹے نے وہیں بیٹھے بیٹھے خبر لکھ ڈالی۔

''دو الگ الگ جماعتوں کے درمیان ہوئے جھگڑے کی وجہ سے آج رات بھٹار چال میں ماحول کشیدہ بنا ہوا ہے۔ دونوں طرف کافی بڑی تعداد میں لوگ جمع ہو گئے تھے اور کافی گرما گرمی کی حالت تھی۔ پولس کی مداخلت کے بعد حالات قابو میں آ چکے ہیں۔ مار پیٹ میں شامل لوگوں کے نام بتانے سے پولس نے انکار کر دیا ہے۔ ایسا بتایا جاتا ہے کہ جھگڑا کسی چھوٹی سی بات کو لے کر شروع ہوا۔ یہ رپورٹ تحریر کرنے تک کوئی بھی گرفتاری عمل میں آئی نہیں ہے۔''

رات کو مسکوٹے کے پاس دوسرے رپورٹروں کے فون آتے رہے۔ ان میں سے کسی نے دو سطروں میں تو کسی نے دو دو کالموں میں دنگے کی خبر لکھ ڈالی۔

مسکوٹے کو گھر جا کر سوتے سوتے رات کے ڈھائی بج گئے۔ سونے سے پہلے اس نے ایک آخری گالی اپنے ایڈیٹر کو دی اور آنکھیں بند کر لیں۔

تین چار انچ کی یہ لمبی خبر ممبئی کے لگ بھگ سبھی روزناموں میں الگ الگ طریقے سے شائع ہوئی۔ کہیں کونے میں تو کہیں پہلے صفحے پر چھوٹی سی، تو کہیں ایسی جگہ جہاں کسی کا دھیان نہیں جاتا، جہاں لوگ اسے پڑھ کر بھول جاتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیسے ماٹونگا کے بجرنگ سیوا سنگھ کے کچھ نوجوانوں نے دوپہر کی سبھا میں اس خبر کا ذکر کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سبھی بھڑک اٹھے۔

''میں کہتا ہوں..... سالے باندرہ کے قصائی خانے سے ہی لوگ بھٹار چال میں آئے ہوں گے۔'' پرکاش نے غصے سے کہا۔

www.urduchannel.in

''ارے یہ ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ ہمارے لوگوں کو وہ اکیلا چھوڑتے ہی نہیں۔ پچھلی بار جو ہوا تھا، یاد ہے نا؟ چونا بھٹی میں ایسا ہی کچھ ہو گیا اور قریب کے قصائی واڑے کے لوگ آ گئے۔ کسی کی ہمت نہیں ہوئی انھیں روکنے کی؟'' ایک نے کہا۔

''اور ہم.....؟ کون کہتا ہے؟ کیا ہم میں کسی سے خون کم ہے؟''

بات سے بات بڑھ گئی۔ آخر میں یہ فیصلہ ہوا کہ بجرنگ سیوا سنگھ کے بیس پچیس ممبران جلوس لے کر بھٹار چال تک جائیں گے جوش سے بھرے ہوئے بجرنگ سیوا نوجوان باندرہ کی طرف چل پڑے۔ دوپہر کے دو بجے جب نعرے لگاتے، جھنڈے لیے ہوئے یہ جلوس بھٹار چال پہنچا تو آرام کرتی ہوئی عورتیں گھبرا کر گیلری میں آ گئیں اور تماشا دیکھنے لگیں۔ کس بات کا جلوس تھا، اس کا انھیں پتا ہی نہ تھا۔ جلوس کیا تھا ایک چھوٹا سا جھنڈ تھا۔ پندرہ بیس مشٹنڈے تھے۔ ان کے چلے جانے پر وہ اپنے اپنے کمروں میں جا کر پھر آرام کی غرض سے لیٹ گئیں۔

بجرنگ سیوا سنگھ کے نوجوان جب بھٹار چال سے باہر نکلے تو وہ کچھ مایوس تھے۔ چال میں کوئی گڑبڑ نظر نہیں آ رہی تھی۔ کچھ لوگ بوکھلائے ہوئے بھی تھے۔ وہ نعرے لگا رہے تھے۔ ''جلا دو، جلا دو، پاکستان جلا دو۔''.....ایسے نعرے بھی بلا وجہ ہی لگا رہے تھے۔ بجرنگ سیوا سنگھ کی ٹولی کو باہر نکلتے ہوئے ماہم ناکے پر یوسف اسماعیل کے اڈّے والوں نے دیکھ لیا۔ انھیں شک بھی تھا۔ بھٹار چال کے بارے میں چھپی خبر ان تک بھی پہنچی تھی۔ بجرنگ سیوا سنگھ کی ٹولی کو باہر نکلتے ہوئے دیکھ کر ان میں ہلچل شروع ہو گئی۔ پیغامات بھیجے گئے۔ جب تک سنگھ کے نوجوان واپس لوٹتے اڈّے کے لوگ تیار تھے۔ سنگھ کے نوجوان ہنستے کھلکھلاتے واپس لوٹ رہے تھے۔ ماہم ناکے پر ان میں اور بھی جوش آ گیا۔ ٹولی کے آخری لڑکے کو روک کر اڈّے کے آدمی نے پوچھا۔ ''کیا بے.....کیا گڑبڑ ہے؟ کیا ہو گیا؟''

اور پھر اس کے گال پر ایک چانٹا رسید کیا۔ اس کے آدمی پیچھے مڑے اور انھوں نے اس چانٹا لگانے والے کی خوب مرمت کی۔ تب تک اڈّے سے اور لوگ دوڑ کر وہاں پہنچ گئے۔ پتھر، لاٹھیاں، بوتلیں وغیرہ کی بوچھار ہونے لگی۔ ٹریفک جام ہو گیا۔ دو ہی منٹ میں

www.urduchannel.in

ساری بات ختم ہوگئی۔ دونوں گروپوں کے لوگ پولس کے آنے پر پرندوں کی طرح اڑ گئے۔ پتھروں اور ٹوٹی ہوئی بوتلوں کا ڈھیر پڑا رہ گیا۔ ادھر اڈے کے لوگ پریشان تھے۔ سنگھ کے لوگ اڈے پر آکر انھیں پیٹ جائیں، یہ بھی کوئی بات ہوئی، رات میں ماٹونگا سنگھ کا بورڈ جس جھونپڑی پر لگا تھا اسے آگ لگا دی گئی۔ اس کے بعد آدھے گھنٹے میں ماہم نا کے پر جس ہوٹل میں اسماعیل کا اڈہ تھا اس ہوٹل کی کرسیاں اور شیشے چکنا چور ہو گئے۔ فٹ پاتھ پر پولس کو ایک لاش ملی۔ ماہم ماٹونگا کی طرف کا سارا ماحول تناؤ سے بھر گیا۔

رات میں جب وزیر داخلہ تک یہ خبر پہنچی تو وہ بہت ناراض ہوئے۔ انھوں نے پولس کمشنر کو فون کیا اور غصے میں بولے۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیا آپ سو رہے ہیں؟ ممبئی میں دنگا ہو رہا ہے اور آپ کو کچھ خبر نہیں ہے۔ فوراً دفعہ ۱۴۴ لگا دیجئے۔''

''دفعہ ۱۴۴ لگا دی ہے سر!'' پولس کمشنر نے آہستگی سے جواب دیا۔

''میں پوری ممبئی کی بات کر رہا ہوں۔ یہ آگ اب اور کیسے پھیلے گی، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔''

دوسرے دن ممبئی کے سبھی اخبارات میں بڑے حروف میں یہ خبر شائع ہوگئی۔ بھنڈی بازار میں ماحول گرم ہو گیا۔ پولس کی وائرلیس گاڑیاں گھومنے لگیں۔ کہیں سے دھواں نکلنے لگا۔ وہ شارٹ سرکٹ کی وجہ سے تھا، لیکن حالات خراب ہو گئے۔ کئی جگہوں سے دھواں نکلتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ دونوں جماعتوں کے لوگ الگ الگ جگہوں سے نکل کر پولس کی پرواہ کیے بنا راستوں پر گھومتے نظر آنے لگے۔ بسیں دکانیں جلنے لگیں۔ اینٹوں اور پتھروں سے چھوٹی موٹی جھڑپیں ہونے لگیں۔ سڑکوں پر لاشیں نظر آنے لگیں۔ آنسو گیس کا اثر نہ ہوا تو پولس کو گولی چلانی پڑی۔ دوپہر کے بارہ بجے تک ممبئی کا سارا کام کاج ٹھپ پڑ گیا۔ اب تک یہ خبر دہلی تک پہنچ گئی تھی۔ دہلی سے بار بار اس دنگے کے بارے میں پوچھ تاچھ ہو رہی تھی۔ مہاراشٹر کے سبھی اہم شہروں میں سخت بندوبست کا انتظام کیا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود دوسرے شہروں سے بھی اس طرح کی خبریں آ رہی تھیں۔ ریڈیو پاکستان بھی اس کے بارے میں خبریں نشر کر رہا تھا۔ تیسرے دن امن و امان ہو گیا۔ اس درمیان چار جگہوں پر دنگا فساد

www.urduchannel.in

ہو چکا تھا۔ کل تیرہ لوگوں کا قتل ہوا تھا۔ ۷ لوگ گولی باری میں مارے گئے تھے۔

ہزاروں کی تعداد میں اقلیتی فرقے کے لوگوں کو اذیتیں دے دے کر مار دیے جانے کی خبریں پاکستان ریڈیو نے نشر کیں۔ پاکستان نے اقوام متحدہ سے اس بات کی شکایت بھی کی۔ پاکستان کی فوج سرحد پنجاب پر تعینات کر دی گئی۔ اس کے خلاف بھارت کو بھی اپنی فوج سرحد پر روانہ کرنی پڑی۔ گاڑیاں بھر بھر کے فوج کے جتھے جانے لگے۔ سرحد پر ماحول کشیدہ ہو گیا۔ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل نے دہلی اور اسلام آباد کا سفر کیا۔ پاکستان کے صدر بار بار دھمکی دینے لگے۔ پاکستانی ہوائی جہاز بھارت کی سرحدوں پر حملے کے لیے منڈلانے لگے۔ ہلکی پھلکی گولا باری بھی ہوئی۔

بھارت کے وزیر اعظم نے عوام کو مخاطب کرتے ہوئے مقابلے کے لیے تیار رہنے کی اپیل کی۔ اس جد و جہد میں سبھی مذاہب کے لوگوں کو آپسی بھائی چارہ بنائے رکھنے کے لیے کہا۔ آخر کار اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل کی سعی پیہم کارگر ثابت ہوئی۔ بھارت اور پاکستان نے اپنی اپنی فوجیں سرحد سے دور لے کر اطمینان سے بات چیت کرنے کی حامی بھر لی اور کشیدگی ختم ہو گئی۔

جس وقت یہ ساری کاروائیاں ہو رہی تھیں اسی اتوار کو مہتا کے گھر میں رمی کی بازی چل رہی تھی۔ بار بار بلانے پر بھی کھانے کے لیے گھر نہ لوٹنے کی وجہ سے اس کی بیوی گھر میں بیٹھے بیٹھے کڑھ رہی تھی۔ کھانا کھا کر قمیض سے منہ پونچھتا ہوا ہرشد گھر سے باہر آیا تو زبیدہ گیلری میں تصویریں بنا رہی تھی۔

''کس کی تصویر ہے یہ؟'' ہرشد نے پوچھا۔

''تیری!''

پھر ہرشد نے کہا۔ ''دیکھ زبیدہ لوکل ٹرین جا رہی ہے، اندھیری، وی۔ٹی، چرچ گیٹ.....آئے گی؟''

زبیدہ نے ہنس کر پوچھا۔ ''دادر بھی جائے گی نا؟ تو چلو!''

☆☆☆

www.urduchannel.in

بے نام

و۔پو۔ کالے

کہتے ہیں جب دو آدمی بات چیت کر رہے ہوں تو تیسرے کو نہیں سننا چاہیے۔ کم از کم شریف کہلانے والے لوگوں کو تو یہ بات مان لینی چاہیے۔میں بھی شریف آدمی ہوں۔مگر وہ دونوں آدمی بھری بھیڑ میں ،لوکل ٹرین میں کھڑے ہو کر زور زور سے باتیں کررہے ہوں تو؟بھیڑ تو اتنی ہوتی ہے کہ اگر کانوں کو انگلیوں سے بند کرنے کے بارے میں سوچیں بھی تو ہاتھ ہی نہیں ہلا سکتے۔ اور پھر بھی کیا بھروسہ کہ اتنی بھیڑ میں اپنا ہاتھ اپنے ہی کانوں تک جائے؟

www.urduchannel.in

ان دونوں میں سے ایک آدمی بڑی اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ کہہ رہا تھا "گھر کے جھمیلے ہی کیا کم ہیں۔" معاملہ گھر کا تھا لیکن پرائیویٹ نہیں تھا۔ اس کے لڑکے نے اسے کیسی مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ وہی قصہ بیان کر رہا تھا۔

"ارے، میں تو آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ روزانہ یہی گاڑی پکڑنی پڑتی ہے۔ نکل گئی تو؟ اسی لیے جلدی سے الماری کھولی، ہینگر سے شرٹ نکال رہا تھا، پتہ ہی نہیں چلا کہ شہزادے نے کیمرہ کب الماری سے نکال لیا۔ اتنے میں میری بیوی چلائی۔ اس کے ڈر سے اس نے کیمرہ ہاتھ سے چھوڑ دیا۔

"ٹھیک، پھر؟" سننے والے نے پوچھا۔

"پھر کیا؟ اس کا لینس بدل گیا۔"

"رولی فلیکس کیمرہ! اب صرف لینس سیٹ کرنے کے لیے پینتیس مانگ رہے ہیں۔ دیکھو آیا نہ یکا یک اس مہینے میں خرچہ۔" سننے والا خاموش تھا۔ لگ رہا تھا کہ ہمدردی دکھانے کے لیے اس کا دل کر رہا ہے، لیکن اسے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ اسی دوران وہ آدمی پھر سے کہنے لگا۔ "تم تو جانتے ہی ہو، اتنی مہنگی چیزیں ہم کتنی مشکل سے خرید پاتے ہیں۔ برسوں تک سپنے دیکھتے دیکھتے، اگر درمیان میں کچھ خرچہ نہ آیا ہو تو ہی لے سکتے ہیں ایسی چیزیں۔ لیکن بعد میں نکلنے والے یہ خرچ بس کی بات نہیں ہوتی۔ اب ان دو مہینوں میں میں کچھ بھی نہیں کر پاؤں گا۔" بولنے والا چپ ہو گیا۔

اب کیا بولوں جس سے اسے تسلی ہو جائے۔ سننے والا اس شش و پنج میں تھا۔ اسی وقت وہاں کھڑا مجھ جیسا آدمی درمیان میں بول اٹھا۔ "آپ بڑے نصیب والے ہیں۔"

یہ جملہ سننے پر صرف وہ کیمرہ والا آدمی ہی حیرت زدہ نہیں ہوا بلکہ آس پاس کے بہت سے لوگ اس آدمی کو دیکھنے لگے۔

وہ انجان آدمی بولا۔ "معاف کیجیے، ویسے تو آپ کی اور میری جان پہچان نہیں ہے، لیکن اتنی دیر سے آپ کی کہانی سن رہا ہوں۔ یعنی سننی ہی پڑی۔ اور اسی لیے تعارف نہ ہونے پر بھی کہتا ہوں کہ آپ نصیب والے ہیں۔ صرف پینتیس روپے پر ہی چھوٹ

www.urduchannel.in

گئے۔ میرے کیمرے کی تو ایسی حالت ہوگئی ہے کہ اب اس میں دانت کا منجن بھر کر رکھ سکتے ہیں۔"

پہلے والے آدمی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تیر گئی۔ نہیں تو اس اجنبی کے ریمارک سے وہ کچھ چڑ سا گیا تھا۔

اب اس نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا، "کیوں؟"

"آپ کے جیسا حادثہ میرے گھر بھی ہوا"

"رولی فلیکس"

اب میں نے اس آدمی کی طرف دیکھا۔ مجھے اچانک محسوس ہوا کہ یہ آدمی جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کو دیکھ کر ایسا نہیں لگتا تھا کہ اس کے پاس رولی فلیکس کیمرہ ہوسکتا ہے۔

"کیمرے کو کیا ہوا؟" پہلے والے آدمی نے پوچھا۔

"کیمرے کا لینس تو بالکل ناکارہ ہوگیا ہے۔ ٹوٹلی آؤٹ آف آرڈر، بی آنڈر پیپرس۔"

"پھر اب؟"

"اب امپورٹ کرنا ہوگا۔ دو سو، تین سو جو بھی مانگیں گے دینے پڑیں گے۔ یہ بات میرے بھی بس کی نہیں ہے۔ آپ دو تین مہینوں میں کیمرہ ریپیئر کر کے استعمال کر سکیں گے۔ مجھے مکمل ایک سال تک رکنا پڑے گا۔ اسی لیے تو کہا تھا کہ آپ بڑے نصیب والے ہیں۔"

اس پہلے آدمی کے چہرے پر کچھ تسلی کی جھلک نظر آئی۔ وہ اپنے دوست سے بولا۔ "یس، آئی ایم لکی۔"

چرچ گیٹ آنے تک ہم سبھی سننے والوں کا وقت اچھا کٹ گیا۔ گرتے پڑتے گاڑی میں چڑھنا پڑتا ہے، اس میں اب نیا کیا ہے؟ گاڑی اگر وقت پر آ گئی تب بھی مشکل، پانچ دس منٹ دیر سے آئی تو پوچھئے مت۔ "اسپیشل جنتا شو" کہنا مناسب ہوگا۔

دھکم دھکا کرتے ہوئے میں گاڑی میں چڑھ گیا، تھوڑی ہی دیر بعد کانوں میں آواز

www.urduchannel.in

گونجی۔

''ارے مار دیا، مار دیا، پاکٹ مار دیا۔'' چلانے والے آدمی نے پینٹ کی جیب جو کٹ گئی تھی، الٹ کر دکھادی۔ ریلوے پاس، پانچ کے تین ٹکٹ، کچھ نوٹ، ریزگاری اور پاکٹ کی جو قیمت ہوگی وہ۔

''[redacted] کر پاس کے پیسے بڑھنے سے پہلے تین مہینے کا پاس بنالیا تھا۔'' وہ آدمی آس پاس کے لو[redacted] بتا رہا تھا۔ فوراً اس نے بھی پر گالیوں کی برسات کی۔ سب سے پہلے جیب کترے پر، پھر بھیڑ پر، وقت پر نہ چلنے والی لوکل پر اور سب سے آخر میں سرکار پر۔ اس کا جوالا مکھی تھوڑا ٹھنڈا ہوا تھا اسی وقت پیچھے آواز آئی۔ '' آپ نصیب والے ہیں۔''

میں نے فوراً اس آواز کی سمت میں دیکھا۔ وہی آدمی تھا۔ رولی فلیکس کیمرہ میں دانتوں کا منجن بھرنے والا آدمی۔ کافی دنوں کے بعد دیکھنے پر بھی میں نے اسے پہچان لیا۔

''نصیب والے؟ آپ پر جب بیتے گی تب پتہ چلے گا۔''

''مجھ پر بیت چکی ہے اسی لیے کہہ رہا ہوں۔ آپ آج تھوڑے ہی میں بچ گئے۔ میرا بٹوا گیا تو اس میں یہاں سے ناگپور تک سیکنڈ کلاس کے پانچ ٹکٹ تھے۔ اس کے علاوہ ساڑھے تین سو روپے نقد، اسی دن اپنے دوست سے میں نے ادھار لیے تھے۔ اب کہیے!''

''آپ سے نصیب والا میں ہوں، لیکن میرے پندرہ روپے آج میرے لیے ڈیڑھ سو کے برابر ہیں۔''

''ایسا ہی ہوتا ہے جناب۔ میرے ساڑھے تین سو روپے بھی اس وقت میرے لیے ساڑھے تین ہزار کے برابر تھے۔ ناگپور کے ٹکٹ کے لیے پھر دوبارہ قرض لینا پڑا وہ الگ ہی ہے۔''

''ریلوے میں بتلایا نہیں؟''

''آپ بھول کر رہے ہیں۔ ریلوے ہمارے لیے نہیں، ہم ریلوے کے لیے

www.urduchannel.in

ہیں۔اس لیے روزانہ یہ تکلیفیں سہ کر بھی ہم سفر کرتے ہیں گاڑی کے ساتھ مسافروں کی ترا۔"

"اسی وقت کوئی بول اٹھا، "شاید یہ آخری یاترا۔"

سب ہنسنے لگے۔ چرچ گیٹ کب آیا پتہ ہی نہیں چلا۔

اس لے بعد بے شمار یاتراؤں میں سے ایک یاترا۔لوکل میں طرح طرح کے لوگوں کی گفتگو..... گجراتی جو اچانک بڑی اونچی اور بھدی آواز میں بولنے لگتے ہیں۔اور مسلسل بولتے رہتے ہیں۔گاڑی کی کڑکڑاہٹ،سر پر بگڑے پنکھے کی کھنکھناہٹ قابلِ برداشت لیکن شیئر بازار میں کڑکڑاہٹ کرنے والے گجراتی سیٹھوں کو برداشت کرنا مشکل ہے۔ویسے ہی دو آدمی بول رہے تھے۔ان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔

"مینی ہیوڈ اینڈ وانٹ آف میڈیکل ٹریٹمینٹ ان ٹائم اینڈ مور آر سر وائیول۔"

روز کی طرح آس پاس کے لوگ ہنس پڑے۔لیکن وہ سننے والا سنجیدہ ہو گیا اور بولا۔

'پتے کی بات کہی۔ڈاکٹروں کی وجہ سے ہی ہمارے سندیپ کا یہ حال ہوا۔"

"کیوں؟ کیا ہوا؟"

"تمہیں پتا نہیں؟"

"مجھے کیسے پتہ ہوگا؟ قریب قریب ایک سال کے بعد ہم لوگ مل رہے ہیں۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔"

"پھر کیا ہوا سندیپ کو؟"

"کیا نہیں ہوا ہے، یہ پوچھو۔بس سردی اور بخار سبب بن گیا۔ڈاکٹر نے اسے پینی سیلین دی۔فوراری ایکشن ہو گیا۔بے ہوش ہوا، ہاتھ پاؤں لکڑی کی طرح ہو گئے۔چار دنوں تک بے ہوش رہا۔پھر ہوش میں آیا لیکن تب سے زبان بھاری ہو گئی ہے، صاف بولتا نہیں۔"

"مائی گاڈ"

www.urduchannel.in

''یہ تو کچھ بھی نہیں۔ مجھے لگا تھا وہ بالکل گونگا ہو گیا لیکن دھیرے دھیرے ٹھیک ہوا۔ اب ویسے تو بولتا ہے لیکن کچھ الفاظ بولتے وقت زبان لڑکھڑاتی ہے۔ میں نے اور میری بیوی نے پچھلا پورا سال بری حالت میں بتایا۔''

تبھی پیچھے سے آواز آئی ''آپ نصیب والے ہیں۔''

وہی آواز۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہی آدمی تھا۔ پچھلی دونوں ملاقاتوں میں میں نے جو ردِعمل محسوس کیا تھا وہی آج بھی محسوس ہو رہا ہے۔

وہ آدمی بولا ''ناراض نہ ہوں۔ آپ اور میں ایک دوسرے سے متعارف نہیں لیکن آپ کی سب بات چیت میں نے سن لی ہے۔ اسی لیے میں نے آپ کو نصیب والا کہا ہے۔ یہی حالت میرے لڑکے کی ہے۔ پنی سیلین کا ہی اثر۔ آپ کا لڑکا جلدی اچھا ہو گیا۔ لیکن آج تین سال ہوئے میرا لڑکا ابھی تک بستر پر ہے۔ تب سے لولا ہو گیا ہے۔ اس کی تمام حاجتیں بستر پر ہی پوری کرنی پڑتی ہیں۔ میری اور میری بیوی کی یہی زندگی رہ گئی ہے۔ ہر گھڑی ہم دونوں میں سے کسی ایک کو اس کے بستر کے پاس ہی رہنا پڑتا ہے۔ آپ بڑے نصیب والے ہیں۔''

''ٹھہریے ذرا۔ مجھے آپ سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔'' گاڑی جیسے ہی چرچ گیٹ پہنچی میں نے اس جھوٹے آدمی کو روک لیا۔ وہ بھی رک گیا۔

''کیسے۔''

''آپ گاڑی میں ہمیشہ لوگوں کو جھوٹی باتیں کیوں بتاتے ہیں؟''

''وھاٹ ڈو یو مین، ایکویکلی؟'' اس نے اطمینان سے پوچھا۔

''پہلے ایک بار رولی فلیکس کیمرے کی کہانی آپ نے سنائی۔ اس کے پاکٹ کٹ ہو جانے پر آپ نے اپنا واقعہ سنایا۔ ساڑھے تین سو روپے ناگپور کی ٹکٹیں، یاد ہیں؟ اور آج ابھی بچے کی بیماری۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ کی یہ ساری باتیں جھوٹی ہیں۔''

میری باتیں ختم ہوتے ہی اس نے شیک ہینڈ کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

www.urduchannel.in

"یوآر ابسیولیوٹلی رائٹ۔ تو وہ تینوں قصے آپ نے سنے تھے؟ ویری گڈ۔"

"مگر میری نظر میں یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

کافی دیر تک میری جانب دیکھتے ہوئے اس نے کہا "ہر آدمی کی گفتگو، حال چال کے پیچھے کچھ خیالات ہوتے ہیں، یہ قبول کرتے ہیں آپ؟"

"ہاں، قبول کرتا ہوں۔"

"پھر میں بھی یہ سب جان بوجھ کر کر رہا ہوں۔ صرف اس مقصد کے کہ لوگوں کو تسلی مل سکے۔"

"کیسی تسلی؟"

"سماج میں اپنے سے بھی زیادہ زخم کسی اور نے کھائے ہیں یہ تسلی۔"

"آئی ہیو ناٹ فالو ڈیو۔"

"بتاتا ہوں۔ انسان کا دل بڑا عجیب ہوتا ہے۔ ہم جب کسی بیمار آدمی کو دیکھنے جاتے ہیں تو ہر بار اس کا حال پوچھنے پر اس کے دل میں یہ بھرم قائم رہتا ہے کہ ملنے کے لیے آیا ہوا آدمی مجھ سے الگ ہے۔ اس کی دنیا الگ ہے۔ یہ دنیا ہٹے کٹے لوگوں کی ہے۔ ہم بیمار انسانوں کی دنیا الگ ہے۔ یہ خیال اسے ہر وقت پریشان کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیمار آدمی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ اس بیمار آدمی کو جب اس سے بھی گئی گزری حالت والا آدمی نظر آتا ہے تب اسے حقیقی تسلی ہوتی ہے۔ تھوڑے بہت سے وقت کی مشکل میں گھرے آدمی کی حالت بھی بیمار آدمی کی طرح ہوتی ہے۔ اسے صرف ہمدردی کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنے سے زیادہ مشکلات میں گھرے آدمی کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اپنی حالت دوسروں سے زیادہ خراب ہے اس خیال سے اسے کوفت ہوتی ہے۔ اپنی حالت دوسروں کے مقابلے ٹھیک ہے۔ بہتر ہے یہ خیال اسے تسلی دیتا ہو۔ ڈو یو فالو؟"

میں نے گردن ہلائی۔

"یہی تسلی میں دیتا ہوں۔ جھوٹ بولتا ہوں یہ سچ ہے۔ میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں۔ دروازے کے سامنے چار موٹریں کھڑی ہیں۔ میرین لائنس پر دو عمارتیں ہیں۔"

www.urduchannel.in

''پھر اس آدمی کی جیب کٹنے پر آپ نے اسے پیسے کیوں نہیں دیے؟''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں، لیکن اس طرح کی مدد کا ہمیشہ فائدہ نہیں ہوتا۔ کسی کے احسان تلے میں دب گیا یہ خیال اُسے نوچتا رہتا ہے۔ اور میں کہتا ہوں یہ موازنہ ہر شخص کرتا ہے۔ پیسوں سے مدد کرنے والے بہت ملتے ہیں لیکن اس طرح کی تسلّی دینے والے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ وہی کام میں کر رہا ہوں۔ اس لیے اگر پھر کسی وقت میں جھوٹ بولتا ہوا تمہیں دکھائی دوں تو..... ڈونوٹ ٹرائی ٹو ایکسپوز می۔''

بات چیت کرتے کرتے ہم اسٹیشن سے باہر آ گئے۔ سچ مچ اس کی امپالا کار باہر کھڑی تھی۔ پہنے ہوئے سادہ لباس میں وہ عالیشان کار میں بیٹھ کر چلا گیا، اور میں اسے دیکھتا رہا۔ نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد بھی اس کی تسلّی بھری باتوں کو محسوس کرتا رہا۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

سفارش

گنگادھر گاڈگل

میری سکریٹری نے اندر آکر بتایا "سر، کوئی دیسائی آپ سے ملنے آئے ہیں۔ میں نے کام پوچھا تو کہتے ہیں پرسنل کام ہے اور بتایا کہ آپ سے اچھی پہچان ہے۔"

دیسائی نام کے بے شمار آدمیوں کو میں جانتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کون ہے؟ میرے چہرے کی طرف دیکھ کر سکریٹری نے کہا "شاید آپ کا کوئی شاگرد ہو؟"

میں نے مسکرا کر کہا "اچھا اسے اندر بھیج دو۔"

عرصہ ہوا، میں پڑھنے پڑھانے کا کام چھوڑ چکا ہوں لیکن ابھی تک میرے شاگردوں نے مجھے نہیں چھوڑا۔ کسی نہ کسی بہانے وہ مجھ سے ملنے آجاتے ہیں۔

www.urduchannel.in

سکریٹری باہر چلی گئی اور دیسائی اندر چلا آیا۔ عمر یہی کوئی پچیس چھبیس سال ہوگی۔ ہال سنوانے کا ڈھنگ بڑا شاندار تھا، ویسے میں نے اسے پہچانا نہیں تھا۔ اپنی پرانی ترکیب اپنا کر میں نے کہا، ''آں..... ویسے چہرہ تو یاد ہے..... لیکن.....''

وہ کھل کر ہنس پڑا، ''میں نے سبھی سے کہا تھا بھلا سر مجھے کیسے بھول سکتے ہیں؟ ہمارا وہ فنکشن کتنا بہترین ہوگیا تھا۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ میں بھی ذرا سا مسکرایا۔ سچ پوچھیے تو مجھے بالکل یاد نہیں آ رہا تھا، وہ کون ہے اور کس فنکشن کی بات کر رہا ہے۔

میں نے پوچھا، ''مطلب یہ ہوا کہ تم میرے کالج میں تھے؟''

اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ کر اور ذرا اونچے لہجے میں کہا ''حد ہوگئی سر، میں کالج سے نہیں آیا تھا آپ کو چیف گیسٹ کی حیثیت سے بلانے؟ واہ کتنا بہترین فنکشن ہوا تھا۔ آپ کو یاد نہیں سر؟''

کسی مجرم کی طرح میں مسکرایا۔ اس کی سوچ واجبی نہیں تھی، پھر بھی ایک نوجوان کو اس بات کا احساس ہونا فطری بات تھی۔

پھر میں نے پوچھا: ''آج کس کام سے یاد کیا مجھے؟''

دوسرے کی بات پر دھیان نہ دے کر اپنے ہی خیالات کا اظہار کرنے کی بہت سے لوگوں کی عادت ہوتی ہے ہوسکتا ہے اسے بھی ہو۔ پھر میرے دفتر کو ایک سرویئر کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس نے کہا، ''واہ! بہت ہی خوبصورت!''

شاید اسی احساس سے اس نے بات ختم کر کے سر ہلایا۔ ہوسکتا ہے اس کی بات میری سمجھ میں نہ آئی ہو۔ ایک دم ٹھوس۔ اسے یہ دکھانا تھا کہ کل ملا کر میں نے اچھا خاصا رنگ جمایا ہے۔

اس نے کہا، ''میں ہمیشہ اپنے اساتذہ کو آپ کی مثال دیتا ہوں۔ گاڈگل سر کو دیکھیے۔ ان کی طرح ہی آپ بھی کچھ کر کے، کچھ بن کر دکھایئے۔''

ظاہر ہے کہ لڑکا واہیات قسم کا تھا اور سچ پوچھیے تو اسے چھپانے کی اس نے ذرا بھی کوشش نہیں کی تھی۔ ایک بار دل میں آیا اسے آڑے ہاتھوں لوں، کھری کھری سناؤں، اس

www.urduchannel.in

کے کان اینٹھوں۔ پھر سوچا بچہ ہے۔ جوانی کی گرم جوشی میں جوان لڑکے اسی طرح بے سرپیر کی ہانکتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن دنیا کے سامنے ان کی دال نہیں گلتی۔ وہ اچھی طرح سے ٹھوک بجا کر سیدھا کرتی ہے ایسے جوانوں کو۔ اس لیے میں نے ملائم لہجے میں کہا: "ارے! ان بچارے پروفیسر کو مفت کی صلاح کیوں دیتے ہو؟ اس سے تو اچھا ہے کہ تم ہی کچھ کر دکھاؤ۔ اب گریجویٹ تو ہو چکے ہوں گے ؟"

"ہاں، تین سال ہو گئے۔ فی الحال نوکری کرتا ہوں..... کمپنی میں....." اس نے بڑے رعب سے ایک کمپنی کا نام لیا۔

"واہ! اچھا ہے۔ مینجمنٹ ٹرینی کی حیثیت سے شروع ہوگا۔ اب کون سی پوسٹ دی ہے تمہیں؟" میں نے اس کی تعریف کرنے کی کوشش کی۔

"وہیں تو مار کھا رہا ہوں۔ اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں۔" اس کے چہرے پر وہی وابیات ہنسی تھی۔

"مطلب؟ کیا ہوا!" میں نے انداز ہ لگا لیا کہ کیا ہو سکتا ہے۔ پھر بھی پوچھا۔

"ہوگا کیا؟ کلاس نہیں ملا۔" اس کے لہجے میں وضاحت تھی کہ یہ غلطی کلاس کی ہی ہے۔ نہ کہ اس کی۔

"چلو چھوڑو، سیکنڈ کلاس تو مل ہی گیا نا؟" بے چارے کا مذاق اڑانا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن مجھے دیکھنا تھا اس کی خود اعتمادی ڈھلنے کی حد کون سی ہے۔

اس نے قہقہہ لگایا: "سیکنڈ بھی نہیں اراکل نہیں سرہائے سیکنڈ کلاس تو ایزیلی مل جاتا۔ ہم لوگ کالج کا کام کرتے رہے اور پڑھائی کے لیے فرصت کہاں ملی؟ آپ یقین نہیں کریں گے سر لیکن آخری پندرہ دنوں میں میں نے پڑھائی کی تھی۔"

یہ قصہ اتنی بار سن چکا تھا کہ اس میں کچھ نیا پن نہیں تھا۔ اس لیے میں خاموش ہی رہا۔ اور ٹیبل پر انگلیوں سے ٹھک ٹھک کرنے لگا۔ اب مجھے لگ رہا تھا اسے روانہ کرنا ہی بہتر ہے۔

"مگر سر، ذرا تماشہ تو دیکھیے۔ ہم نے کالج کے لیے اتنا پسینہ بہایا، ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ لیکن کالج ہمارے لیے کچھ بھی کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔" اپنی قابلیت بگھارتے

www.urduchannel.in

بگھارتے اس کا چہرہ تمتما گیا تھا۔

''اچھا؟'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

''اور کیا سر! ہم سے کولہو کے بیل کی طرح کام کروایا۔ اتنا ہی نہیں، کالج میں اسٹرائک ہونے والی تھی تب پرنسپل صاحب نے ہمیں بلوایا اور مجھ سے پرسنل درخواست کی، تم ہی یہ ہڑتال روک سکتے ہو۔ تب سر میں نے لڑکوں کو سمجھایا اور ہڑتال روکی۔ بڑا پاپولر ہو گیا تھا اور آخر امتحان کے دنوں میں میں نے پروفیسر..... کو اپنا کوڈ نمبر دیا تھا لیکن انھوں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ مطلب یہی ہوا نا سر کہ ان لوگوں نے ہمارا ناجائز فائدہ اٹھایا۔'' اس نے اِس ڈھنگ سے میری طرف دیکھا کہ میں اس کی بات کی حمایت کروں۔

اس کی حمایت کرنا میرے لیے ناممکن تھا، اسے سمجھانا بیکار تھا، کیوں کہ جو خیالات اس کے ذہن میں گہرائی تک جڑیں بنا چکے تھے انھیں ذہن سے نکالنا ممکن نہیں تھا۔ اسی لیے میں نے پرسکون انداز سے کہا، ''لیکن بھلا پروفیسر کیا کر سکتے ہیں اس معاملے میں؟''

''اجی کیا کہہ رہے ہیں جناب! پانچ سو روپے لے کر پرچے بتاتے ہیں۔ پانچ دس ہزار دینے پر انٹر سائنس میں فرسٹ کلاس اور میڈیکل میں ایڈمیشن..... یقینی.....''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کیا جواب دیتا؟ اس کی سوچیں غلط رُخ اختیار کیے ہوئے تھیں۔ لیکن یہ بھی اتنا ہی سچ ہے کہ اس کی شکایت بھری باتوں میں کچھ سچائی بھی تھی۔

اس نے مزید تاؤ کھاتے ہوئے کہا، ''ہم غریب ہیں نا سر؟ بھلا ہم کہاں سے دیں گے اتنے سارے روپے؟ اس دنیا میں غریبوں کی کون سنتا ہے؟ ان کی اوقات ہی کیا ہوتی ہے؟''

میں نے سوچا، ہالی ووڈ کا ہیرو ہی میرے آفس میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ میں نے غور کیا کہ وہ بھلے ہی ان ہزاروں، لاکھوں لوگوں کو اچھا لگ رہا تھا، پسند آ رہا تھا، مگر مجھے تو تیلی جیسا لگ رہا تھا۔ فلمی دنیا کے عقلمند لوگوں نے اس بات کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا۔ وہ کاٹھ کے اُلو نہیں تھے۔ پہنچے ہوئے گھاگ تھے۔

میں نے ٹیبل کو انگلیوں سے بجایا، پھر کہا، ''جانے بھی دو۔ کہا جاتا ہے نا، دانا نہ گھاس گھوڑے تیری آس۔ ہمیں اس سے کچھ لینا نہ کچھ دینا۔ دنیا کے مسائل ہم بھلا کہاں

www.urduchannel.in

تک حل کر سکتے ہیں؟ بتاؤ، کیا کام ہے تمھارا؟ مجھے زیادہ فرصت نہیں ہے۔"

"سر، مجھے ذرا سی مدد چاہیے۔ آپ کی یعنی کہ ذرا سی، پُش چاہیے۔" اس نے آگے جھک کر کچھ اس ڈھنگ سے کہا جیسے مجھ پر بھروسہ کر کے اس نے میری عزّت افزائی کی ہے۔

کس سے سیکھے ہوں گے یہ سارے طور طریقے؟ یہ سوچتے سوچتے میں خاموش رہا کہ اس طرح کا برتاؤ اسے اچھا لگے گا یا نہیں۔ اس بات کا فیصلہ اس نے کب اور کیسے کیا ہوگا۔ اس نے اِس امید پر کہ میں کوئی سوال کروں گا۔ کچھ انتظار کے بعد اس نے کہا، "سر ہماری کمپنی اونچے عہدوں کی خالی اسامیاں بھر رہی ہے۔ وہاں مجھے چانس چاہیے۔ اب دیکھیے سر، اپنے کام میں میں اتنا قابل ہوں کہ میرٹ کی بنیاد پر مجھے یہ پوسٹ کمپنی آفر کرے۔ لیکن آج کل کا قصہ ہی کچھ اور ہے۔ سبھی جگہ سفارش چاہیے۔ سب کچھ سفارش کے بل بوتے پر چل رہا ہے سر۔ سفارش اور مٹھی گرم کرنے والی رشوت۔ ہر جگہ سفارشی ٹٹو بھرتی ہو رہے ہیں۔"

یہ بات زندگی میں ناکام ہونے والے اتنے لوگوں سے میں نے سنی تھی کہ اب اِس سلسلے میں میرے دل میں کچھ بھی ردِّ عمل نہیں ہوتا تھا۔ ایک بات تو یہ ہے کہ ان تمام باتوں کو سماج سے دور کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ میں اچھی طرح سے جانتا تھا کہ جس میں قابلیت ہے وہ ہر حال میں اپنی راہ تلاش کر لیتا ہے۔ لیکن اس نصیحت کا اُس پر کیا اثر ہوتا؟ چکنے گھڑے پر پانی جیسا۔ زیادہ تر لوگ اسی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ اپنی ناکامی کے لیے حالات کو ذمّہ دار قرار دیا جائے۔ میں نے کہا، "اس میں میں کیا کر سکتا ہوں؟ مجھ سے نہیں ہوتیں یہ ساری باتیں۔"

اس نے قہقہہ لگایا، "سر..... آپ بھی کیا فرما رہے ہیں یہ سب؟ آپ نے اپنا کیریئر اتنا اچھا بنایا ہے۔" میرے دل و دماغ میں اچانک غصّے کا بگولہ اٹھنے لگا۔ لیکن میں نے صبر کا گھونٹ پی کر اپنے آپ کو مطمئن رکھا۔ جو کامیابی حاصل کرتا ہے اُس کے بارے میں بے شمار لوگوں کی یہی رائے ہوتی ہے اور ہزار ہا کوششوں کے باوجود اس رائے کو بدلا نہیں جا سکتا بلکہ اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ میری خاموشی سے اُس میں جوش بڑھ گیا اور وہ میری مغز پچّی کرنے لگا۔ ایک سمجھ دار اور کاروباری انسان کی ہنسی بکھیرتے ہوئے اس نے کہا، "سر آج جو کالج کے

www.urduchannel.in

پرنسپل بن گئے کیا وہ بنا کسی پُش کے؟ نہیں سر، آپ کی قابلیت کے بغیر..... لیکن بنا کسی پُش کے کوئی کچھ نہیں بنتا۔ یہ بات جانے دیجیے۔ لیکن آپ اتنے نامور ادیب بن گئے اُس وقت بھی آپ کو کسی نہ کسی نے پُش ضرور کیا ہوگا۔ میں اس ابتدائی دور کی بات کر رہا ہوں۔ بتایئے، آپ کی کہانیاں مدیروں نے کس طرح شائع کیں! سچ پوچھیے تو یہ مدیر ارسال کی گئی کہانیاں پڑھتے ہی نہیں ویسے ہی معذرت کے ساتھ لوٹا دیتے ہے۔ میرے ایک دوست نے لطیفہ بنایا تھا، اپنی کہانی کے صفحات گم سے چسپاں کر دیے اور انھیں مدیر کے پاس روانہ کر دیا وہ اسی حالت میں معذرت کے ساتھ لوٹا دیے گئے۔ مطلب یہی ہے سر کہ مدیر صاحب نے پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی..... ہاہاہا....."

مجھے بھی ہنسی آ گئی۔ کئی سال سے بے شمار ادیبوں اور شاعروں کی یہ شکایت میں سن رہا ہوں کہ مدیر ہماری تخلیقات نہیں پڑھتے۔ اس میں کسی حد تک سچائی بھی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی کئی نئے تخلیق کاروں کی تخلیقات شائع ہو رہی ہیں اور وہ مقام بھی بنا رہے ہیں۔

میں نے اس سے پوچھا، "کیا تم بھی لکھتے ہو؟"

اس نے اطمینان سے کہا، "ادب سے میرا لگاؤ تو ہے سر! اگر میں پختہ ارادہ کر لوں تو بے حد معیاری ادب تخلیق کر سکتا ہوں۔ ایسا ادب جسے دیکھ کر دنیا ششدر رہ جائے۔ لیکن کیا کروں! کالج میں یونین کے جھمیلوں میں الجھا رہا اور اب یہ نوکری کا مسئلہ، لیکن پتہ کی بات کہہ دیتا ہوں سر، اگر میں نے اپنے ہاتھ میں قلم تھام لیا تو آپ بھی دیکھتے رہ جائیں گے۔ گستاخی معاف سر، لیکن سچ کہا جائے تو آپ جیسے پرانی لکیر کو پیٹنے والے ادیبوں کو اصل زندگی کی جدوجہد کبھی سمجھ میں ہی نہیں آئی۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا، "اب ہم تو بوڑھے ہو چکے ہے۔ ہمارا زمانہ ختم ہوا۔ اب تم جیسے تازہ خون کو آگے بڑھنا ہوگا۔" وہ خوش ہو گیا اور اس مقصد سے میں نے کہا کہ یہ گفتگو ختم ہو۔ "دیکھو، مجھے اب بھی بہت سے کام ہیں۔ اسی لیے....."

"سر، مجھے بھی جانا ہے۔ میرا اتنا سا کام کر دیجیے نا! ابھی اسی وقت فون اٹھایئے۔ صرف ایک فون کی ہی بات ہے۔ چٹکی بجاتے ہی کام ہو جائے گا۔" اس نے آگے

www.urduchannel.in

جھک کر اتنا اپنا پن دکھایا جیسے ہمارا بہت پرانا میل جول ہو اور ہماری گہری سانٹھ گانٹھ ہو۔

یہ تو بالکل جونک کی طرح چپک گیا۔ اتنی دیر تک رکا ہوا غصہ ابل کر باہر آ گیا۔ پھر بھی اس پر قابو پاتے ہوئے میں نے کہا، ''میں نے کہہ دیا ہے نا کہ تمھاری کمپنی کے کسی بھی آدمی کو میں نہیں جانتا۔''

اس نے مسکرا کر گردن ٹیڑھی کی۔ پھر ترچھی نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا، ''اجی کیوں بے کار کی بہانے بازی کر رہے ہیں آپ۔ یہ ساری باتیں مجھ سے مت کہیے۔ ہمارے چیئرمین کا نام ہے..... ایک ہی پلیٹ فارم پر آپ دونوں کو باتیں کرتے ہوئے میں نے دیکھا۔''

اس کے چہرے پر چالاکی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے چڑ کر کہا، ''میں نہیں جانتا تھا کہ وہ تمھاری کمپنی کے چیئرمین ہیں۔ ایک پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے کا مطلب یہ تو نہیں ہوتا کہ ہم ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ اس لیے فون پر کس طرح سفارش کی جا سکتی ہے۔''

''مطلب یہ ہے سر کہ آپ میرا اتنا سا کام نہیں کریں گے؟'' اس کی آواز میں ترشی تھی۔ اس کی باتوں سے میرے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اب مجھے صاف نظر آنے لگا کہ مجھے بھی اپنے دائرے سے باہر نکلنا ہوگا۔ پھر بھی میں پرسکون انداز اختیار کیے رہا۔

میں نے کہا، ''کیا کہہ رہے ہو؟ بھلا میں ٹیلیفون کیسے کروں؟ ہاں، ان سے میری اچانک ہی ملاقات ہو گئی تو پوچھ تاچھ کروں گا۔''

اس نے اپنے سر کو یوں جھٹکا دیا جیسے وہ جانتا تھا کہ اس بات میں کوئی دم ہے یا نہیں، اس کا چہرہ غصے اور منافرت سے سخت ہو گیا۔ میں نے بھی ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے دو ٹوک انداز سے کہا، ''دیکھو، مجھے بہت سے کام ہیں۔''

میری بات ان سنی کر کے اس نے طنز سے کہا، ''ہم مراٹھی لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں سر! کبھی اپنے لوگوں کے کام نہیں آتے۔ گجرات اور ساؤتھ کے لوگوں کو دیکھیے لیکن ہمارے لوگ کبھی نہیں سدھریں گے۔ صرف اپنی روٹی پر ہی گھی لگائیں گے۔ ہمیں دوسروں کی پرواہ کہاں؟ دوسرا چاہے مرے یا جیے۔ ہے نا.....؟''

www.urduchannel.in

اب غصہ سے کانپتے ہوئے میں یکا یک اٹھ کھڑا ہوا اور چلایا، ''اب تم یہاں سے دفع ہوتے ہو یا نہیں؟ آئی سے گیٹ آؤٹ!''

اب چاہے کچھ بھی ہو، اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ اس حالت میں مجھے دیکھ کر سٹپٹایا اور سر جھکا کر جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

میں ویسے ہی بے چینی کی حالت میں کھڑا رہا۔ مجھے اس پر ترس آ رہا تھا۔ وہ جو خیالات پیش کر رہا تھا، وہ اس کے اپنے نہیں تھے۔ الگ الگ موقعوں پر مختلف اسٹیج سے اس کے دل و دماغ میں بھر دیے گئے تھے۔ یہ بات نہیں کہ ان خیالات میں سچ کا عنصر نہیں تھا۔ بس اس نے اتنا ہی کیا کہ ان خیالوں کو اپنے فائدے کے لیے بھنانا چاہا تھا اور اپنی ناکامی کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال کر خود آزاد ہو گیا تھا۔ اسے کسی نے بھی یہ نہیں بتایا تھا کہ اس سلسلے میں اس پر بھی کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے..... اور اندر سے بھی اس نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا ہوگا.....

اداسی کے عالم میں ایک ایک قدم اٹھا کر وہ دروازے کے پاس گیا۔ دروازہ کھولنے کے لیے اس نے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور پھر اچانک غصے سے پیچھے مڑ کر کہا، ''سر، میں..... میں اس طرح سڑنا نہیں چاہتا۔ مجھے کچھ بننا ہے۔ صرف مجھے موقع ملنا چاہیے۔''

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسوں بہہ نکلے۔ وہ دکھ کے تھے، غصہ اور شرم کے تھے۔ پھر وہ دروازہ کھول کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

کیا ہوگا اس لڑکے کا؟ شاید کسی شعلہ بیان سیاسی گروہ کا وہ حصہ بن جائے گا۔ شاید حالات کے بلڈوزر کے نیچے کچل کر، لاچار، دوسروں پر بوجھ بنا ہوا، زندہ جئے گا۔ شاید اپنے بیوی بچوں پر اپنا سارا غصہ اتار کر ان کی زندگی میں دکھ، گھٹن اور دہشت پیدا کرے گا۔ یا پھر خونخوار درندہ بن کر حکومت میں شامل ہو جائے گا۔ اپنا الو سیدھا کرتا رہے گا.....

شاید..... شاید.....

میرے کیبن کا خودکار دروازہ آہستہ آہستہ بنا آواز کے بند ہو گیا.....

اور میں شرم سے پانی پانی ہوتا رہا.....

☆☆☆

www.urduchannel.in

پرندہ

دیا پوار

دعاء کی گھنٹی بجی۔ ہنستے کھیلتے ہوئے بچّے قطاروں میں آکر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ بچّوں کی قطار کے ساتھ مدرّسین کی ترچھی سی قطار ہے۔ ٹپ ٹاپ ٹپ ٹاپ کی آواز آتی ہے۔ پر وقار شخصیت کے مالک پرنسل آتے ہیں۔ چال دیکھ کر ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ کافی سال این سی سی میں رہ چکے ہیں۔ جاز موسیقی کی آخری لے جیسے ہی ڈوبتی ہے ویسے ہی بچّوں کا شور وغل بند ہوجاتا ہے۔ وہ منہ میں دبی ہوئی سیٹی بجانے ہی والے ہیں کہ وامن پھاٹک سے آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ہانپتا ہوا۔ اس کی بشرٹ پر نظر پڑتے ہی چاروں طرف سے ہنسی کا ایک فوارہ چھوٹتا

www.urduchannel.in

ہے۔ وامن ایک ہیرو نما شرٹ پہنے ہوئے ہے۔ اس پر بھڑکیلے رنگوں میں مختلف جانوروں کی تصاویر پرنٹ کی ہوئی ہیں۔

یہ گیاندیو ہائی اسکول بڑے شہر سے دور ایک گاؤں میں ہے۔ ممبئی پونہ کے جدید فیشن گاؤں تک پہنچتے پہنچتے کافی وقت لگتا ہے۔ جس طرح انٹ چھاپ بیڑی کو مشتہر کرنے والی موٹر کے اوپری حصے پر جوکر کو دیکھ کر ہنسی بالکل رکتی ہی نہیں، اسی طرح کا یہ منظر بھی تھا۔ وہ ہکا بکا سا کھڑا رہ جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر سب کیوں ہنس رہے ہیں؟ وہ سمجھ ہی نہیں پاتا۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ زلزلے سے زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

''شندے! یو گیٹ آؤٹ'' پرنسپل صاحب غصے سے وامن کو ڈانٹتے ہیں۔ ان کی آواز سب کو خاموش کر دیتی ہے۔ مکمل سناٹا چھا جاتا ہے

برسات کی رِم جھم سے بھیگے، ٹھٹھرتے بچھڑے سا وامن ہاتھ میں موجود کتابوں کو سنبھالتے ہوئے اپنی کلاس کی جانب مڑ جاتا ہے۔ کلاس میں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ دعا کی آواز اس کی سماعت سے ٹکراتی رہتی ہے۔

سب کے سامنے ہوئی بے عزتی سے اس کا دل بیٹھ سا گیا ہے۔ آخر اس نے ایسا کونسا گناہ کیا ہے؟ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے کسی نے دوزخ کی آگ اس پر الٹ دی ہو۔ کانوں میں گونجنے والی دعا کی آواز، موت کے گیت جیسی لگتی ہے۔ بچپن ہی سے کتنی بے عزتی ہوتی رہی ہے۔ ایسی زندگی کوئی کہاں تک گزارے! دل برسات کے بادلوں کی طرح بھر جاتا ہے۔

دھپ سے وہ بینچ پر بیٹھ جاتا ہے۔ آنکھوں سے آنسو ٹپکنے ہی والے ہیں کہ دعا سے لوٹتے ہوئے بچوں کی آہٹ اسے ٹھیک سے بیٹھنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ''کیوں وامنیا، ہیرو بنے گا؟ اچھی درگت بن گئی تیری۔'' سب سے پہلے جماعت میں داخل ہونے والے سجاش نے اسے چھیڑا۔

''ارے جانے دے..... پرانچے سے عشق لڑا رہا ہے۔'' سدھیر نے کہا۔ کلاس ابھی تک لڑکیوں سے خالی ہے۔

www.urduchannel.in

''اپنا منہ تو شیشے میں دیکھ ذرا! سجاش پھر آگ لگاتا ہے۔ سب پھر ہنسنے لگتے ہیں۔ کسی زہریلے پودے کا دودھیا رس بدن پر لگانے سے جس طرح چمڑی جلنے لگتی ہے ویسی ہی وامن کو جلن محسوس ہو رہی ہے۔ اسی وقت سامنت سر کلاس میں آجاتے ہے وامن کو چھٹکارہ ملتا ہے۔

''وامن شندے کون ہے؟ بڑے سر نے آفس میں بلایا ہے۔'' اسکول کا چپراسی آکر کہتا ہے۔ سبھی کی نگاہیں وامن کی جانب اٹھ جاتی ہیں۔ وامن کی اب اچھی خبر لی جائے گی، سب یہی سوچتے ہیں۔ یہ تو اس نے بھی سنا تھا کہ بڑے سر ٹیبل پر ہاتھ رکھوا کر زور سے چھڑی مارتے ہیں۔ اپنی کوئی غلطی نہ ہونے پر بھی سزا ملے گی۔ کیوں؟ کس بات کی؟ سوچتے ہوئے وہ پرنسل صاحب کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔

''کیوں شندے سرکار! آپ کا رکھ رکھاؤ تو خوب بڑھ چڑھ کر دکھائی دے رہا ہے۔ ارے شیڈول کاسٹ ہی تو ہو نا! ہمیں ایسے لچھن زیب نہیں دیتے۔ انسان کو سادہ رہنا چاہیے۔ مہاتما گاندھی اتنے مہان انسان..... لیکن انگلینڈ جاتے وقت بھی انھوں نے اپنی سادگی نہیں چھوڑی۔ ہمارا دیش دلِدّر ہے۔ یہ بات دھیان میں رکھ کر ہی جینا چاہیے۔''

وامن گردن اٹھا کر بولتے ہوئے پرنسپل صاحب کو دیکھتا ہے ان کی انگوٹھی کا لال نگینہ اس کا دھیان کھینچتا ہے۔ انھوں نے خود تو ٹیرلین کے اچھے خاصے مہنگے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ عمدہ عطر کی خوشبو بھی آرہی ہے۔ نصیحت کرنے والے ایسے ہوتے ہیں۔ وامن کچھ کہنا ہی چاہتا ہے۔ ''مگر سر.....''

''کچھ مت کہنا۔ ایک لفظ بھی نہیں۔ سرکار کے داماد ہیں آپ لوگ..... فیس ادا کرنی نہیں پڑتی..... یہ سب ڈھنگ تو سیکھو گے ہی..... جاؤ اپنی کلاس میں..... دوبارہ ایسے کپڑے پہن کر مت آنا۔

وامن کا حلق سوکھ جاتا ہے۔ سر اسے کوڑے بھی مارتے تو وہ سہہ لیتا مگر روح کو جھنجھوڑنے والے ایسے الفاظ! مرجھایا ہوا سا وہ کلاس میں لوٹ آتا ہے۔ سنسکرت کا پریڈ چل رہا ہے۔ سامنت سر پڑھا رہے ہیں۔ اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے وہ اِدھر اُدھر نظریں گھماتا

www.urduchannel.in

ہے۔سب کے چہروں پر طنزیہ ہنسی دکھائی دیتی ہے۔دوسری کلاس میں بچّے لوکمانیہ تلک کی نظم ''کتنا غصّہ'' زور زور سے پڑھ رہے ہیں۔جس کا مفہوم یہ ہے کہ شکاری پرندے پر پے درپے وار کرتا ہے۔پرندہ گھائل ہوجاتا ہے۔مگر خون میں لت پت پرندہ آخر کار اپنے گھونسلے میں پہنچ ہی جاتا ہے۔نظم کے الفاظ میں اسے اپنی ہی تصویر نظر آتی ہے۔گھر پہنچ کر شرٹ کو آگ میں جھونک دینے کو دل چاہتا ہے۔اپنی بے عزّتی کا سبب،اپنے ہی کپڑے !کس حالت میں اسے یہ کپڑے پہننے پڑے تھے۔اسے یاد آتا ہے۔

دیوالی کی چھٹیوں میں چاچا کے گھر ممبئی گیا تھا۔ہر وقت وہاں جانے کے لئے اس کا دل راضی نہیں ہوتا تھا۔لیکن چھٹی شروع ہونے سے پہلے ہی ماں ممبئی جانے کا راگ لے کر اس کے پیچھے پڑ جاتی تھی۔ممبئی جانے سے کھانے کی بچت بھی ہوجاتی تھی۔ساتھ ہی ساتھ دو جوڑی کپڑے اور کتابیں بھی اس کی جھولی میں پڑ جاتے تھے۔وہ جانتا تھا کہ اس کا اور بہن کا پیٹ بھرنے ے لئے ماں کو کتنی تکلیف اٹھانی پڑتی ہیں۔وامن پڑھ لکھ کر کہیں نوکری کرے ۔اسی امید کے سہارے ماں زندگی کی گاڑی کھینچ رہی تھی۔ماں کی حالت دیکھ کر وہ بے چین ہوجاتا۔مگر کچھ نہ کر پانے کا درد اس کے چہرے پر ہر وقت دکھائی دیتا۔

چاچا جس بستی میں رہتے ہیں اسے یاد کر کے وامن کے رونگھٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ سمیٹ کی چال میں لوگ کیسے رہتے ہیں!چاروں طرف گندگی،غلاظت،چوہوں،گھوسوں کی چہل پہل،کھلی ہوئی گٹر،سیڑھیوں کے نیچے ہاتھ بھٹی،(دیسی شراب) کا اڈّہ۔عجیب طرح کی بو چاروں طرف پھیلی ہوئی رہتی ہے۔اور اتنے لوگ کہ ہاتھوں سے مکھیاں مار سکیں۔چاچا۔چاچی۔ان کے بچّے اور ساتھ میں چار اور بھی کرایہ دار ایک ہی کمرے میں۔کون کہاں سوئے؟رات کو یہ ہی سمجھ میں نہیں آتا۔

چاچا کی تنخواہ کا دن وامن کو یاد آتا ہے۔چاچا شراب پیتے تھے۔اس قدر کہ کوئی سنبھالنے والا نہ ہو تو لٹیا کی طرح لڑھک جائیں۔اس نشے میں کہیں جوا کھیلنے اڈّے پر پہنچ گئے تو ساری تنخواہ ہار کر لوٹیں گے۔پھر کتابیں کہاں سے آئیں گی۔یہی فکر کھائے جاتی ہے۔

''وامن کہاں ہے؟'' چاچی کے ہاتھ میں کھٹائی کی پڑیاں رکھ کر وہ چلاّتے

www.urduchannel.in

ہیں۔ وامن سامنے آتا ہے۔ تو شراب کی بو سے اس کا جی متلانے لگتا ہے۔

''وامنیا، ارے تیرے باپ کو میں نے وچن دیا کہ۔ تجھے امبیڈکر جیسا بالسٹر بناؤں گا۔ تبھی اپنی ذات کا نام لگاؤں گا.....'' چاچا شراب کے نشے میں دھت بولتے ہیں۔ وامن کو اپنے باپ کی یاد آتی ہے۔ شراب پی پی کر وہ مر گیا تھا۔ کلیجہ پھٹنے سے۔ مرتے وقت کی تکلیف یاد آتے ہی وہ کانپ اٹھتا ہے۔ تب اس کا باپ رات دن نشے کی حالت میں رہتا اور یہ چاچا شراب کی ایک بوند بھی نہیں چھوتا تھا۔ اکھاڑے میں جا کر لاٹھی گھماتا رہتا تھا۔ ورزش کرتا تھا اس وجہ سے اس کا جسم مضبوط تھا۔ لیکن جس دن باپ مرا اسی دن سے چاچا شراب میں ڈوب گیا۔

کیوں پیتا رہتا ہے؟ یہ الجھن وامن آج تک سلجھا نہیں پایا۔

''چلو، تمہیں کپڑے لے کر دیتا ہوں'' چاچا آج خوش تھے۔ چاچا کی بات سن کر انگھیٹی کے سامنے بیٹھی چاچی روٹی بناتے ہوئے اسی جگہ بڑبڑاتی ہے۔ ''لٹھا! کپڑے لے کر دے رہا ہے۔ ارے کل بڑا ہو کر اچھے پیسے کمائے گا تو کیا دے گا تجھے؟ پوچھے گا بھی نہیں یہ''

''چپ بیٹھ گدھی..... عورت کی عقل ہے کتنی؟.....'' چاچی کو ڈانٹ کر چاچا چپل پیر میں پہن کر باہر نکلتے ہیں۔ بے دلی سے وامن چاچا کے پیچھے پیچھے چلتا رہتا ہے۔ اُسے لے کر اسی طرح چاچا اور چاچی میں جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ چاچا اس بارے میں ابھی بھی چاچی کی بات سنتا نہیں۔ مگر یہ سوال اسے ہمیشہ جھنجھوڑتا رہتا ہے کہ کہاں تک ان لوگوں پر اپنا بوجھ ڈالتا جائے۔ کئی بار دل چاہتا ہے کہ اسکول چھوڑ کر کچرا خانے میں داخل ہو جائے۔ اور اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔ لیکن مین ہول میں کیسے اترے؟ جہنم کے ڈبے کیسے کھینچے؟ نفرت سی ہوتی ہے۔ پچھلی پیڑھیوں سی اپنی حالت نہیں ہونے دیں گے۔ آج نہیں تو کل اس غلاظت سے باہر نکلیں گے بے عزتی سے بچیں گے۔ یہ خیال مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ اور وہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ گول پیٹھے کے نزدیک پہنچ کر ریڈی میڈ کپڑوں کی سجی سجائی دکان دیکھ کر وہ علی بابا کی طرح گپھاؤں میں داخل ہوتا ہوا اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑاتا ہے۔ چاچا ایک دکان پر ٹھہرتے ہیں یہاں بہت بھیڑ ہے۔ چاچا ایک سیلز مین سے وامن کی ناپ کی ڈریس نکالنے کے لئے کہتے

www.urduchannel.in

ہیں۔ کپڑوں کا ڈھیر سامنے آجاتا ہے۔ وامن اپنے لئے نیلی شرٹ اور سفید پینٹ کا انتخاب کرتا ہے۔ یہ دیکھ کر چاچا غراتے ہیں۔ ''ارے بے وقوف..... کچھ عقل بھی ہے؟ انگریزی اسکول میں جاتے ہو نا؟ پتہ ہے رعب دار کپڑے پہن کر کیسے گٹ پٹ کرنا چاہیے؟''

وامن آس پاس دیکھتا ہے تو چاچا کو دیکھ کر سب ہنستے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ شرمندہ ہوجاتا ہے۔ ''ارے بھائی بھاری والا کپڑا ہے نا دکان میں؟ وہ دکھاؤ....

☆☆☆

www.urduchannel.in

شور

آ۔نا۔ پیڈنیکر

بابلا صحیح وقت پر آگیا تھا۔ آدھی رات بیت چکی تھی۔ کچھاھی دوری پر موجود چٹان سے لہریں ٹکرا کر سفید جھاگ کے ساتھ دوبارہ سمندر میں شامل ھورھی تھیں۔ موسلادھار بارش کے بعد طوفانی ھوائوں کے ساتھ سمندر کی لہروں کا شور برابر جاری تھا۔ لیکن شام کے بعد اب بارش تھم سی گئی تھی۔ پھر بھی بجلیاں چمک رھی تھیں اور بادل گرجنے کی آوازیں کانوں کو باقاعدہ جھنجوڑ رھی تھیں۔

ایسے موسم میں کچھوے کی مادہ سمندر کے کنارے آکر ریت کے گڑھوں میں انڈے دے کر چلی جاتی ھے۔ اسی مقصد سے تو بابلا صحیح وقت پر وھاں پہنچ گیا تھا۔ چار، چھ سال پہلے وہ کشتی پر کام

www.urduchannel.in

کرتا تھا اور ابھی دنوں ایک پاؤں میں چوٹ آجانے کی وجہ سے وہ لنگڑا ہو گیا تھا۔ اپنے اسی لنگڑے پاؤں سے ریت کو ٹٹولتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ کبھی کبھار لکڑی کو ریت میں گڑا ہوا باہر نکالتا، اور اسے سونگھ کر ٹوہ لیتا تھا۔ اسی دوران میں تاریکی کو چیرتی ہوئی ایک بجلی روشنی بکھیر کر پلک جھپکتے ہی غائب ہو گئی۔ لیکن اس ایک پل میں ہی سارا کنارا جیسے روشن ہو گیا تھا۔ بابا کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ مشرق کی سمت بال بکھرائے ناریل کا پیڑ یہ نظارہ یک ٹک دیکھ رہا تھا۔ وہاں نزدیک ہی اتھلی کے پیڑ سے کچھ ہی دوری پر گھاس پھونس کی جھونپڑی میں وہ رہتا تھا۔ رات کی سیاہی اور بجلی کی روشنی میں اسے دھواں اگلتی ہوئی اپنی جھونپڑی برابر دکھائی دیتی تھی۔ اس دھند لکے میں تلملاتی اپنی بیوی کی کسک اسے یاد آئی۔ وہ حاملہ تھی، اور کسی بھی لمحے ڈیلیوری ہو سکتی تھی۔ اگر اس دوران اسے کوئی تکلیف ہو جائے تو.......... ؟

اسے پچھلے سال کی تکالیف کا احساس ہوا، اس کا روم روم سہر اٹھا۔ کسی بھی قیمت پر وہ اس نحوست کو واپس نہیں آنے دینا چاہتا تھا۔ اس سال اچھی خاصی کمائی کی اسے امید تھی۔ کچھوے کی مادہ کے انڈے بیچنے سے بھی درکار آمدنی ہو سکتی تھی۔ اگر بارش کا موسم نہ ہوتا تو مچھلی پکڑ کر اس نے کافی پیسہ کما لیا ہوتا، لیکن اب وہ کوئی دوسرا دھندا بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔ وہ شکار کی ٹوہ میں ریت پر قدموں کے نشان چھوڑتے ہوئے چل رہا تھا۔ اسی دوران زوردار بارش شروع ہو گئی۔ اس کی بچی کچھی امیدوں پر بھی پانی پھر گیا۔ اس نے جیب سے بیڑی اور ماچس نکالی۔ لکڑی کے نیچے رکھ دی، اور ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر اطمینان سے دو چار کش کھینچے۔ دل پر چھائی ہوئی مردنی چھوٹ جانے سے وہ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ کنارے کی طرف نگاہیں دوڑاتے ہوئے وہ دو قدم اور آگے بڑھا۔ اس کا بایاں قدم جیسے ریت میں دھنس گیا۔ اس نے فوراً بیڑی پھینک دی اور اطمینان سے وہیں کھڑا رہا۔

لہروں کا شور کچھ حد تک کم ہو گیا تھا۔ اور انھیں دھیمی دھیمی لہروں کے ساتھ ایک مادہ کچھوا کنارے کی جانب آرہی تھی۔ پانی سے باہر آ کر کچھوی کچھ دیر چپ چاپ بیٹھی رہی۔ ایک لمبی دوری طے کرنے کے بعد اب کنارے پر آجانے سے کچھوی شاید راحت کی سانس لے رہی تھی۔ دھیرے دھیرے بچتے بچاتے وہ آگے بڑھنے لگی۔ آخر کار ایک اچھی سی جگہ دیکھ

www.urduchannel.in

کر وہ ٹھٹھک گئی۔ اسی جگہ اس نے اپنے چاروں پیروں سے ریت ہٹا کر گڑھا بنانا شروع کیا۔

اب شاید وہ تھک کر چور ہوگئی تھی۔ اور اس کی تکلیف برداشت سے باہر ہوگئی تھی۔ پیٹ میں موجود سینکڑوں انڈے اسے بے چین کر رہے تھے۔ ایک ڈیڑھ فٹ گڑھا بن گیا تو وہ جیسے تیسے کر کے اس میں بیٹھ کر ایک ایک انڈا دینے لگی۔

بابلا سے اب رہا نہیں گیا ایک نکمے پاؤں سے ریت کھودتے ہوئے وہ کچھوی کے گڑھے کے پاس پہنچ گیا۔ کچھوی کا کام ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ بابلا غور سے دیکھتا رہا۔ پیٹ سے باہر آئے ہوئے ہر انڈے کے ساتھ وہ زوردار سانس لیتی تھی۔

عین موقع پر پہنچنے کی خوشی میں بابلا شرابور تھا۔ آدھے گھنٹے کی دیر بھی بابلا کو ناامید کر سکتی تھی۔ اس دوران کچھوی انڈے دے کر گڑھا پاٹ دیتی اور پیٹ کے بل ریت کو دبا دبا کر اس جگہ کو ہموار کر دیتی، بلکہ لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے نزدیک ہی کسی اور جگہ ریت کو اوپر نیچے کر دیتی اور اپنا کام بخوبی پورا کرنے کے بعد وہ سمندر میں پھر سے چلی جاتی۔

اس دوران بارش کا ہلکا سا دور بھی آجاتا تو باقی نشانیاں بھی مٹ سکتی تھیں۔ کسی کو کچھ پتہ بھی نہ چلتا اور تین ہفتے یوں ہی بیت جاتے۔ اس کے بعد ریت کے خول کو توڑ کر کچھوے کے بچے باہر آتے اور لہروں کی آہٹ پا کر اس سمت آگے بڑھتے اور سمندر میں کہیں کھو جاتے اپنی ماں سے ملنے۔

لیکن یہ سب انڈے اب بابلا کی گرفت میں تھے۔ وہ ان انڈوں کو بیچ کر کافی روپے کمانے کے چکر میں تھا۔ انڈوں میں سوئی سے سوراخ کر کے ابالے ہوئے انڈے بڑے ذائقہ دار لگتے ہیں۔ یہ برہمنوں کی اولاد کو بھی معلوم تھا۔ بلکہ اس کا چسکا لگ جانے سے وہ منھ مانگے داموں پر انڈے لیتے تھے۔ اسی لیے بابلا سب سے پہلے برہمن برادری سے ہی رابطہ قائم کرنے والا تھا۔

کچھوی نے انڈے دینے کا کام پورا کیا اور گڑھے سے باہر آ کر اسے بھرنے لگی۔ بابلا نے یہ دیکھا اور اس کا پچھلا پیر پکڑ کر اسے سمندر کی جانب اچھال دیا۔ کچھوی بے چاری

www.urduchannel.in

سمندر کے نمکین پانی میں کہیں کھو گئی۔

بابلا نے وہ سفید سفید نرم نرم گولے اپنی تھیلی میں سمیٹ لیے اور امنگوں بھرے انداز میں وہ گھر کی طرف لوٹ ہی رہا تھا کہ راستے میں شری کھوت اس سے ٹکرایا۔ کسی کی باڑی سے ناریل چوری چھپے سمیٹ کر بورا سر پر لادے وہ اپنے گھر واپس جا رہا تھا۔ شری کھوت نے اسے روک کر پوچھا، ''کتنے انڈے ملے؟''

''یہی کوئی سو ڈیڑھ سو۔ ایک بھی نہیں چھوڑا۔''

''بھلے آدمی نشانی کے طور پر ایک آدھ انڈا تو پڑا رہنے دیتے۔''

بات چیت کرتے ہوئے انھوں نے راستہ ناپا اور وہ دونوں بابلا کے گھر پہنچ گئے۔ بابلا کی بیوی درد کے مارے ابھی بھی کراہ رہی تھی۔ وہ بہت ہی بے چین تھی۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر شری کھوت نے بابلا سے کہا۔ ''تم پاروِدائی کے پاس جاؤ اور اسے بلا لاؤ۔ وہ گھر میں ہی ہوگی۔ میں ابھی اپنی بیوی کو لے آتا ہوں۔''

دائی کے آجانے پر بابلا نے کمبل بچھایا اور دیوار سے ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ گیا۔ اب اندر اس کا کچھ کام نہیں تھا۔ شری کھوت کی بیوی اور دائی حالات کو سنبھالنے کے لیے کافی تھیں۔ بابلا کی بیوی کی آہیں کراہیں باہر بھی سنائی دے رہی تھیں۔

خوفناک ہواؤں کے ساتھ سمندر کا شور بدستور سنائی دے رہا تھا۔ بیچ بیچ میں بارش بھی ہو جاتی تھی۔ بارش کے بعد درختوں کے پتوں سے گرتی ہوئی بوندیں آواز پیدا کر رہی تھیں۔ تھکا ہارا بابلا بوجھل آنکھوں سے جھپکیاں لے رہا تھا۔ پھر بھی اس کے کان برابر جاگ رہے تھے۔ کمرے کے اندر کی آوازیں اس کے کان میں برابر آ رہی تھیں۔ بیچ بیچ میں وہ چونک کر آنکھیں کھول لیتا۔ مگر پھر وہ اپنے آپ بند ہو جاتیں اسے کئی طرح کے خیالات پریشان کر رہے تھے۔

اس کی بیوی کی یہ تیسری زچگی تھی۔ پیدا ہوتے ہی بچے مرتے رہے..... بیوی کی آہیں اور کراہتا ہوا چہرہ ..... انڈے لینے کے بعد کچھوی کو سمندر میں پھینکنا..... گڑھے میں سے انڈے نکال لینا..... انڈے نکالنے والا اس کا ہاتھ یکا یک

www.urduchannel.in

غائب ہوااوراس کی جگہ پارودائی کا ہاتھ دکھائی دینے لگا.....دائی کی کھلی ہتھیلی.....اس پر رکھے ہوئے پچیس روپئے.....روپیوں کی جگہ کچھوی کے انڈے.....وہ لرز اٹھا، سہم گیا۔

اسی دوران بجلی کوندی۔شری کھوت نے اسے جھنجوڑا تو وہ ہوش میں آ گیا۔ٹٹی کے پارٹیشن پر عورت کی پرچھائیں دکھائی دی۔اس نے شری کھوت سے پوچھا،''کیا کبر ہے؟''

''لڑکا ہوا۔''شری بدبدایا۔

لڑکا! بابلا کو یقین ہی نہیں ہو رہا تھا۔اچھی طرح سے جاگ جانے میں بابلا کو تھوڑی پریشانی بھی ہوئی اور وقت بھی لگا۔شری کا ہاتھ پکڑ کر وہ اٹھنے لگا۔شری بابلا کی بے چینی کو بھانپ گیا۔وہ آہستہ آہستہ بدبدایا،''جب تمہارے مقدر میں یہی تھا تو وہ بے چاری کیا کرتی..... ؟اوپر والے کی یہی مرضی ہو تو اس میں تیری بیوی یا دائی کا کیا قصور ؟''

بابلا کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔وہ دھم سے نیچے بیٹھ گیا۔اسے لگا، جیسے وہ زمین میں دھنستا چلا جا رہا ہے۔کافی دیر بعد اس کی حالت نارمل ہو پائی۔لڑکھڑاتے ہوئے وہ اندر گیا اور دیوار کے سہارے کھڑا رہا۔قندیل دوبارہ دھواں اگل رہا تھا۔

اس کی بیوی ابھی بھی کراہ رہی تھی۔بابلا نے مایوس نگاہوں سے دیکھا۔بیوی کی آنکھوں میں بے بسی اور بجھے بجھے سے جذبات تھے۔وہ سہم گئی۔

وہاں پاس ہی کپاس میں لپٹا ہوا بے جان بچہ پڑا تھا۔پارودائی بازی ہارنے کے انداز میں بابلا کی بیوی کو دیکھ رہی تھی۔اور شری کی بیوی کہیں خلاء میں آنکھیں جمائے ہوئے تھی۔ہر ایک کا انداز الگ تھا۔وہاں کے سناٹے میں داڑیں ڈالنے والا سمندر کا شور جیسے بابلا کے خیالات پر بے رحمی سے حملے کر رہا تھا۔

لیکن اب پنچھی اُڑ چکا تھا۔اس بے جان کو ٹھکانے لگا ہی باقی رہ گیا تھا۔شری نے سینے پر پتھر رکھ کر روئی میں لپٹے اس بے جان بچے کو اٹھایا۔بابلا کی جانب دیکھا اور چل دیا۔بابلا بھی جذبات سے عاری اٹھ کھڑا ہوا۔سائبان کے کونے میں رکھا ہوا بیلچا اٹھایا اور چپ چاپ شری کے پیچھے ہولیا۔

www.urduchannel.in

شری کھوت شمشان میں ایک جگہ ٹھٹھک گیا۔ اور نیچے جھک کر اس نے کہا، "یہی گڑھا ٹھیک رہے گا۔ تھوڑا اور کھود لیتے ہیں۔"

بابلا نے کچھ نہیں کہا۔ شری کے کہنے پر اس نے چپ چاپ گڑھا گہرا کیا۔ اور شری کے ہاتھوں سے اپنی امانت لینے لگا۔ روئی میں لپٹا ہوا وہ ننھا سے کچھوے کے انڈے کی یاد دلا رہا تھا۔ وہی اجلا اجلا چکنا چکنا، نرم، ملائم، احساس۔ وہ ہاتھ اس بوجھ کو سنبھالنے میں شل ہوئے جا رہے تھے۔

اس نے بھاری من سے اپنے جگر کے ٹکڑے کو گڑھے میں رکھ دیا اور چاروں طرف دیکھا۔ اسے ایک انجان خوف نے گھیر لیا اور ایک موہوم سی خوشی سے وہ شرابور ہو گیا۔ کچھ دیر پہلے جس گڑھے سے اس نے کچھوی کے انڈے اڑا لیے تھے، اسی گڑھے میں اس نے اپنے بچے کو سلا دیا تھا۔

کام ختم کر کے کچھ ہی دیر میں وہ دونوں بے دلی سے گھر کی جانب چل پڑے۔

پگڈنڈی کے سرے پر آتے ہی بابلا ٹھٹھک گیا۔ اس نے شری کو بھی رکنے کے لیے کہا۔ اور اپنے بچے کے گڑھے کی طرف ٹکٹکی لگائے کھڑا رہا۔ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر بھی وہ گھورتا رہا۔ وہاں جانے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"اب چل بھی....." شری نے کہا۔

"وہ دیکھو....." بابلا نے شری سے کہا۔

"کیا ہے..... ؟ کہا..... ؟"

جہاں ہم اسے دفنا کر آئے ہیں..... وہاں سمندر کی طرف دوڑتے ہوئے کوئی جا رہا ہے..... دیکو، دیکھو....." کہہ کر بابلا وہاں رکا ہی نہیں۔ بائیں پیر کی ریت کھوندتے ہوئے وہ سمندر کی جانب دوڑ پڑا۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

نجات

گوری دیشپانڈے

مدھو کر کافی دنوں بعد امریکہ سے لوٹا تھا۔ بغیر اطلاع دیئے ایک دن وارد ہو گیا۔ اس دن ہمارے گھر پارٹی تھی۔ تبھی سارے لوگ اس کی ہر ایک چیز کی تعریف کرنے لگے اس کا جدید انداز کا فلور بائم ڈبل نٹ (اس کی جانب دیکھ کر میں پسینے سے شرابور ہو رہی تھی) کی لگاتار تعریف ہو رہی تھی۔ اس کی کلائی پر سیکو گھڑی جلن کو ہوا دے رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کی سمنائٹ بیگ کی تعریف ہوئی۔ اس کا سنہری لائٹر دیکھ کر پیشانی پر بل پڑنے لگے.....وغیرہ وغیرہ۔

میں نے دھیان نہیں دیا۔ سب مدھو، سالے اور دیگر بھدّی بھدّی گالیوں سے اس کا سواگت

www.urduchannel.in

کر رہے تھے۔ اور مجھے غصہ آ رہا تھا۔ امریکہ جا کر بھی کچھ سیکھ نہیں پایا۔ پہلے ہی کی طرح کبھی بھی آ جاتا ہے، گھر میں جو کچھ بھی ہو کھانے کو۔ اس کا صفایا، ڈرائنگ روم میں پیر پسار کر سوئے گا۔ ایسی بھی کیا ہندوستانیت! مگر عادت سے مجبور! یہ مدھوکر میرے شوہر کا چھوٹا بھائی یعنی میرا دیور۔ اب اتنے سالوں میں گھر کے سبھی لوگوں سے اسے ملنے والی عزت و احترام کی مجھے عادت ہو جانی چاہئے تھی۔ مگر یہ بھی فطری مجبوری تھی۔

پارٹی کے بعد منوہر نے اصل موضوع چھیڑا۔ یہ تو طے ہی ہے کہ مدھوکر نامی آدمی کے بڑے بھائی کا نام منوہر ہوگا اور میری نند کا نام! بالکل صحیح فرمایا، مندا کنی۔ ایسے میں ساس سسر کے نام بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

کیا مدھوکر، اب تو کر ہی ڈالو۔ لڈو کھانے کے لیے سارے لوگ ترس رہے ہیں میں نے جیسے کوکا کولا کی بوتل ہی اس کے سر پر دے ماری۔

''ارے، ارے، کتنی پاگل ہے تو! امریکی لڑکیاں ایسی نہیں ہوتیں۔''

''کیوں مدھوکر! ادھر ہی کوئی چکر ہے کیا؟''

مدھوکر بولا: ''میں کیا پاگل ہوں تمہاری طرح..... بیوی بچوں کا پھندا گلے میں لٹکانے کے لیے۔ اب تو عورتیں ادھر بریٹ ہو گئی ہیں۔ بار میں لے جانے پر آدھے پیسے لڑکیاں دیتی ہیں۔

منوہر کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ کیا سالے کیا بتا رہا ہے، اب تو بھی بریٹ ہو جا، کیوں؟

بی۔ اے کی ڈگری کا دبدبہ میں چہرے پر اوڑھنے ہی والی تھی کہ مدھوکر بول اٹھا، جانے بھی دو بھابھی۔

میں نے دانت، ہونٹ بھینچ لیے۔ مندا کنی، مدھوکر اور منوہر کے ماں باپ مجھے ہمیشہ طنز کا نشانہ بناتے تھے۔ مجھے ہدف و ملامت کرتے۔ تین تین بیٹیوں کے بارے میں مجھے ٹوکتے۔ مگر میں اس کی عادی ہو گئی ہوں۔ پھر بھی دانتوں تک کڑوے کسیلے الفاظ آ ہی گئے۔

www.urduchannel.in

مدھو کر بولے جارہا تھا۔ ''ایسا ہے، خاندان آگے بڑھانے کے لیے کوئی تو چاہئے۔ میں تو آؤٹ ہوگیا ہوں اس لیے اب سارا دارومدار منوہر پر ہی ہے۔

ونش چلانے کے لیے! نام بھی کیا ہے۔ کلکرنی! صرف شیواجی پارک کے چوراہے پر کھڑے ہوکر، کلکرنی پکارنے پر ایک ہزار کلکرنی جمع ہوجائیں گے۔

میں خاموش رہی۔ (شوہر کو بڑوں کی غیر موجودگی میں ہی) منوہر کہنا ہی میری آزادی کی، بغاوت کی علامت تھی۔ لڑکیاں کچن میں بیٹھ کر کھانا کھا رہی تھیں ان کی جانب دیکھ کر محسوس ہونے لگا۔ اگر ممکن ہوتا تو آٹھ بیٹیاں پانے کی منت مانگتی ہماری بوڑھی دادی۔ جب سے مجھے یاد ہے وہ گٹھری بنی ایک کونے میں بیٹھی رہتی۔ پتاجی مجھ پر یا بندو پر کبھی ناراض ہوتے تو وہ انھیں کہتی، ہری ہر بچیوں پر ناراض نہیں ہوتے۔ بڑھاپے میں وہ خیال رکھتی ہیں بیٹے کیا کرتے ہیں۔ صرف دو وقت کی روٹی دیں گے۔''

پتاجی انھیں کچھ نہیں کہتے۔ مگر ہمارے سامنے بڑبڑاتے، پھر جاؤ نا مونا کے پاس، نہیں تو امیکا کے گھر۔ تب سے لگتا دادی کیوں نہیں جاتی بوا کے گھر! کیوں ماں کی بھلی بری باتیں سنتی رہتی ہے؟ بعد میں تو وہ اسی طرح سوچنے سمجھنے کی قوت بھی کھو بیٹھی تھی۔ کیونکہ منوہر کی جانب سے پتاجی سے جب میرا ہاتھ مانگا گیا تب وہ بولے تھے، ارے سدھو' آج نہیں تو کل شادی تو کرنی ہی ہے۔ بی۔ اے ہونے کے بعد اکیلی گرہستی نہیں بسا سکتی نا؟ پھر اسی سے شادی کرلے۔ ناک نقشہ اچھا ہے۔ ذمہ داریاں نہیں ہیں۔ ممبئی میں نوکری ہے۔ ایسے میں کچھ سال تک راجا رانی آزاد رہیں گے۔

میں موٹی گردن ہلا کر 'ہاں' کہہ گئی۔ خیال ہی نہیں آیا کہ کیوں نہ اکیلے ہی گرہستی بسائیں؟ پھر کیا تھا۔ شادی گرہستی، بچے یکے بعد دیگرے تین بیٹیاں ہونے تک ان عورتوں پر اسٹینڈرڈ کمنٹ یا طنز کریں تو بھی برا نہیں لگتا۔ گھر میں مندا کنی کے شوہر' منوہر کے دو تین دوست' پڑوسی یکجا ہونے پر ڈرائینگ روم میں یہی سب چلتا رہتا۔ شادی نہ کرنا ہی بہتر۔ ایسے لگتا ہے جیسے عورت ذات پر احسان کرنے کے لیے ہی یہ نرسمہا اور سادھو سنت گھوڑی پر سوار ہوتے ہیں۔ مگر پچھلے کچھ دنوں سے کافی خیالات ابھر رہے تھے۔ چھوٹی کا دماغ پڑھائی میں خوب چلتا ہے۔ اس

www.urduchannel.in

لیے میں نے موضوع چھیڑا میں نے کہا۔ ''اسے بہت پڑھانا ہے۔''

منوہر کہتا ہے۔ ''کس لیے پڑھانا ہے لڑکی ہی تو ہے۔''

''بیٹیوں کا پیٹ نہیں ہوتا نا' وہ بھرنے کے لیے؟'' میں نے فوراً کہا۔

پل بھر کے لیے منوہر چونکا۔ پھر فوراً بولا۔ ''لگتا ہے تیرا نہیں بھر رہا ہے؟ ایسے ہی اس کا بھی۔''

مجھے جواب نہیں سوجھا۔ مگر دل میں یہ بات گھر کرنے لگی، عورتوں کو بھگوان نے پیٹ کا گڑھا بھرنے کے لیے آدمی کا سہارا دیا' یہ تو ٹھیک ہے..... مگر بول نہ سکی۔

دادی کا اس زمانے کے لحاظ سے جینا ٹھیک تھا۔ دوسری کوئی بات ہی نہ تھی۔ اب لگتا ہے۔ مدھو کر کہتا ہے ''ویسا ہوا تو کتنا اچھا..... منوہر کے ساتھ چوپاٹی جائیں گے۔ بھیل پوری کھائیں گے' پرس کھول کر بھیل والے کی ہتھیلی پر پچاس پیسے رکھ دیں۔ تیز چلتے ہوئے ٹکٹ کی لائن میں کھڑے ہو جائیں، اپنا ٹکٹ خرید کر، آرام سے بیٹھ کر سنیما دیکھیں، بس میں بیٹھ کر گھر آجائیں۔''

باہر ہنسی کی آواز ابھری۔ میں نے جا کر کہا۔ ''تھالیاں تیار ہیں۔ لے جایئے، منوہر نے جلدی سے کچھ چھپالیا۔

کھانا کھاتے وقت مدھو کر کا امریکی لڑکی پر بھاشن جاری تھا۔ میں ایک کان سے سن رہی تھی۔ سب حمایت کر رہے تھے۔ تمہارا سوچنا ہی ٹھیک ہے! ایسی لڑکیاں قریب ہوں تو کون پاگل شادی کرے گا؟'' مندا کنی اور دوسروں کی بیویاں اندر باہر جا رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ ''مرد بھی کیا ہوتے ہیں۔ کل قمیض کے بٹن بھی ٹوٹ گئے تو خود چل کر پاس آئیں گے، ٹانکنے کی التجا کریں گے۔''

مجھے لگا کہ ان مردوں کو شادی، بچے، بیوی کی وجہ سے اتنی پریشانی ہوتی ہے تو ہم سب مل کر ایک کام کریں۔ سبھی عورتیں مل کر ایک کالونی بنائیں۔ بڑی سی، وہاں سبھی مردوں کے لیے داخلہ فیس مقرر کر لی جائے۔ قمیض دھونا ہے..... رکھو پیسے، روٹی چاہئے نا، نکالو پیسے۔ عورت چاہئے نا بستر میں، پیسے نکالو۔ بیٹا چاہئے خاندان بڑھانے کے لیے، پیسے دو۔

www.urduchannel.in

مزہ آیا، ممی آئی، ممدرا ئی کو بتاؤں۔" کیا کہے گی؟" معلوم ہے۔ دماغ خراب ہوگیا ہے کیا سندھو تیرا؟"

مہمان اور مدھوکر کے جانے تک بچیاں سوگئی تھیں۔ بتی بجھا کر میں ان کی چادریں ٹھیک کرنے کے لیے، کتابیں سنوارنے اٹھی تو دیکھا چھوٹی جاگ رہی ہے۔ یہ پہیلی، عرف امرتا میری ہم خیال ہے۔ عمر پانچ سال ہے۔ میں نے کہا" کیوں ری امرتا بائی؟" وہ بولی:" ماں ہمارا ٹکٹ چاند پر جانے کے لیے خرید کر رکھو، آج اسکول ٹیچر کہہ رہی تھیں، جب تم سب بڑی ہوں گی، چاند پر جانے کے لیے ہوائی جہاز تیار ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا۔" ارے تو ہی خلاباز بن جانا۔ پھر مجھے بھی چاند پر لے جانا۔"

اس نے پوچھا۔" کیوں ماں عورتیں بھی خلاباز ہوتی ہیں۔"

"ہوتی ہے نا؟"

"واہ، واہ تب تو میں ضرور جاؤں گی۔"

چاند پر جانے کا تصور ذہن میں بھرتے ہوئے سوگئی۔ میں اس سے کہتی رہی۔ امرتا جب تو بڑی ہوگی نا؟ کسی سے شادی مت کرنا۔ سب کام خود کرنا۔ پیٹ بھرنا، گھر چلانا، جب محسوس ہو کہ کوئی بچہ ہو تب........ پر پھر کیا مزہ رہے گا۔"

ڈرائنگ روم میں لوٹی تو دروازے کے پیچھے کوئی چیز چمکتی ہوئی نظر آئی۔ جھک کر اٹھایا۔ میگزین تھا، اوپر برہنہ عورت کی تصویر دیکھ کر رکھنا چاہا پر لگا کہ دیکھیں اندر کیا ہے؟ اندر بھی اس طرح کی تمام تصاویر تھیں۔ مدھوکر کچھ بولے تھے۔ ہاں یاد آیا۔ ایک ایک فوٹو کے لیے عورتیں، ہزار پانچ سو روپے لیتی ہیں۔ مجھے محسوس ہوا۔ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ہمارا عریاں بدن دیکھنا ہے نا، نکالو پیسے۔

اندر لباس زیب تن کیے ہوئے کسی عورت کی تصاویر بھی تھیں۔ انٹرویو۔ لمبے بال، بڑا چشمہ گول۔ دادی کی طرح گنوار تھی۔ اس نے کیا کیا ہے؟ کتاب لکھی ہے۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا۔ دی بیو ہیڈ انیف یہ ٹھیک لگا، پڑھنے بیٹھ گئی۔ دیکھتے دیکھتے دو گھنٹے بیت گئے۔ مجھے احساس ہوتا رہا۔" اسے کیسے معلوم ہوا یہ؟ یہی تو ماں پتاجی نے کہا تھا مجھ سے یہی تو ساس سسر

www.urduchannel.in

کہتے ہیں۔ یہی تو روز منوہر کہتا ہے اسے کیسے معلوم ہوا؟

ارے باپ رے! عورت کی زندگی بے حد مشکل ہوتی ہے۔ بیٹا چاہئے بہو۔ سندھو زیادہ بکواس نہیں چاہئے۔ تجھے اس معاملے میں کچھ نہیں معلوم۔ بہت زیادہ پڑھائی کی ضرورت نہیں عورتوں کو صرف چولہا، چوکا، ہانڈی برتن سینا پرونا اور بیڈروم کی زینت بننا بس یہی سب کرنا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں سوچنا، کچھ تصور کرنا۔ ان عورتوں کو نوکریاں کیوں دیتے ہیں۔ کسے پتہ؟ اسی وجہ سے کسی بے چارے کی روزی روٹی چھنتی ہوگی۔ بے وجہ پھٹے میں پیر ڈالنے کی عادت ہوتی ہے عورتوں کی۔ عورتیں یعنی عورتیں ہی ہوتی ہیں۔

.....عورتیں.....سچ مچ ایسا ہی چلتا ہے عمر بھر۔ تمہیں کیسے معلوم؟ آگے بڑھ کر کیا لکھتی ہیں وہ؟

جیسے دنیا میں صرف جسمانی (طبعی) لحاظ سے مختلف ممالک وجود میں آئے ہیں دنیا مختلف حصّوں میں تقسیم ہوئی ہے ویسا ہی یہ ایک حصّہ ہے اور کچھ نہیں۔ کچھ اونچے ہوتے ہیں، کچھ بونے، کوئی کالا تو کوئی گورا، کچھ کے بال سنہرے ہوتے ہیں تو کچھ کے کتھئی۔ کسی کا کچھ ہوتا ہے تو کسی کا کچھ۔ اس کے علاوہ عورت مرد کے بیچ کوئی فرق نہیں ہوتا۔ سنا امرتا تم نے؟.....تو بول کیا نام رکھیں اپنی اس چاندکی کالونی کا؟ مگر ایک بات ذہن نشین کر لے ہم فرش یا عرش پر کتنی بھی کمندیں ڈال لیں مرد کا برتاؤ عورت کے لیے یہی ہوگا جو میں لمحہ بہ لمحہ بھوگ رہی ہوں۔ اس سے کبھی نجات نہیں ملے گی.....سن رہی ہو نا امرتا۔ مگر امرتا تو میٹھے خوابوں میں گم تھی۔ کروڑوں لڑکیوں کی طرح، مگر نجات کے سارے راستے مسدود تھے۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

آزادی

شلیجا کالے

پرس اور تھیلی مضبوطی سے پکڑ کر وہ بس سے نیچے اتری۔ کب سے کھڑی تھی وہ اس بھیڑ میں۔ پرس، تھیلی اور اپنا بدن سنبھالنے کی ورزش کرتی ہوئی۔ لیکن اترتے اترتے کسی نے دھکا دے ہی دیا۔ اس نے اِس طرح نفرت سے دیکھا جیسے کوئی چھپکلی بدن پر رینگ گئی ہو۔ لیکن ٹھہرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ ان باتوں کو بھول جانا ہی بہتر تھا۔ جلدی جلدی وہ نیچے اتری۔ لوگوں کی بھیڑ سے خود کو دور کر کے ایک پل کے لیے یوں ہی کھڑی رہی۔ بس آگے نکل گئی اس میں سے اترنے والوں کا جھنڈ بکھر گیا۔ لیکن وہ اسی طرح

www.urduchannel.in

کھڑی تھی کھوئی ہوئی۔ کچھ سوچتی ہوئی۔

''ارے اُرمیلا تم؟ یہاں کیوں کھڑی ہو؟'' بملا چاچی نے پاس آکر پوچھا تب کہیں اسے ہوش آیا۔ ''کیوں، بہت تھک گئی ہو کیا؟'' انھوں نے پھر پوچھا۔

''نہیں، نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔'' اُرمیلا کا اتنا جملہ ہی بملا چاچی نے سنا ہوگا بس۔ آگے کچھ سننے سے پہلے ہی ہمیشہ کی طرح وہ بڑبڑانے لگیں۔

''پھر کیا راستے کا لطف لے رہی تھی؟ اب کیا اس طرح کا لطف اٹھانے کی عمر ہے تمہاری؟ تم کیا اپنے آپ کو چھوٹی بچی سمجھتی ہو! کتنی عجیب بات ہے! اُدھر سدھا بہن گھر پر کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ پروچن میں جانے کے لیے کب سے تیار بیٹھی ہیں وہ۔ تمہارے آنے سے پہلے کہیں جا نہیں سکتیں بے چاری۔ پورا دن گھر اور بچے۔ شام میں ہی کچھ فرصت ملتی ہے انھیں اور اِدھر تم کھڑی ہو آرام سے۔ شاباش، ابھی ابھی تمہارے ہی گھر سے تو آرہی ہوں۔''

وہ فوراً چل پڑی۔ تھوڑی دیر ٹھہرتی تو چاچی کا توپ خانہ چلتا ہی رہتا۔

اصل میں گھر جاتے ہوئے بنیئے کی دکان سے کچھ چیزیں اسے خریدنا تھیں۔ اسی سوچ میں وہ کھڑی تھی۔ چونکہ دکان میں بھیڑ دکھائی دے رہی تھی اس لیے وہ سوچ رہی تھی کہ کیا کرے؟ اسی دوران بملا چاچی نے اسے آلیا۔ ویسے مہینے کا پورا سامان مہینے کے شروع میں بھر لیا تھا اس نے۔ لیکن کل پندرہ اگست تھی۔ یومِ آزادی کی تعطیل ہونے کی وجہ سے کل کھانے میں کچھ خاص چیزیں تیار کرنا پڑیں گی۔ حلوہ بناؤ تو اس میں بھی کاجو، کشمش تو چاہیے ہی۔ نہیں تو دادا جی کھائیں گے نہیں، اور اوپر سے ہمارے تمہارے زمانے کا لیکچر شروع ہو جائے گا۔ مکھن بھی لانا ہے۔ لیکن اب اور آگے جانا ممکن نہیں تھا۔

وہ بنیئے سے سامان لے رہی تھی اور تھیلی میں ڈال رہی تھی لیکن چاچی جان بوجھ کر دور سے اسے گھور گھور کر دیکھے جا رہی تھی۔

جلدی جلدی قدم بڑھاتے ہوئے وہ گھر پہنچی۔ ساس اندر باہر چکر کاٹ رہی تھی۔ اُرمیلا کو دیکھ کر پہلے تو ان کے چہرے پر خوشی چھائی۔ لیکن کچھ ہی پل میں کافور ہو گئی۔ اوہ! کتنی

www.urduchannel.in

دیر ہو جاتی ہے گھر آنے میں۔ شام کو بھی مجھے فرصت نہیں ملتی۔'' ساس نے کہا۔ ''بہت بھیڑ ہوتی ہے ماں جی، دو بسیں چھوڑنا پڑیں۔']

''اتنی دیر راہ دیکھ کر آخر میں نے اپنی چائے بنا ہی لی۔ انھوں نے نہیں پی ہے۔ وہ اٹھیں گے تب انھیں پوچھنا۔ میں جاتی ہوں اب مندر۔ نرملا بہن تو پہلے گئی ہے۔ دیر سے پہنچنے پر بیٹھنے کے لیے اچھی جگہ نہیں ملتی اور پیچھے بیٹھنے سے پروچن اچھی طرح سنائی نہیں دیتا۔'' ساس اپنی ہی بات کہے جا رہی تھی۔ اُرمیلا نے جو کچھ کہا اس کی طرف ان کا دھیان ہی نہیں تھا۔ فوراً چپل پہن کر انھوں نے کہا۔ ''ارے ہاں، چھوٹی پتیلی میں دودھ گرم کرنا ہے، اسے ذرا ابال کر رکھنا۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل پڑیں۔

اُرمیلا اندر آئی۔ جیسے کسی ڈیوٹی کا چارج سنبھالا ہو۔ ایک ڈیوٹی ختم اور دوسری شروع۔ سچ پوچھیے تو وہ سب سے تنگ آ گئی تھی۔ پورا دن کرسی پر بیٹھ کر بدن میں اینٹھن ہو رہی تھی۔ ایک ایک کام مکمل کرتے کرتے فائلوں کا بنڈارا کرتے ہوئے گردن ٹوٹنے لگتی ہے۔ اوپر سے باس کی ڈانٹ ڈپٹ.....

''یہ لیٹر یہاں کیوں پلیس کیا؟ اس بجٹ کی کوری کا کیا ہوا؟ اسٹیٹمنٹ بنا کر دو روز ہوئے وہ اب تک ٹائپ کیوں نہیں ہوئے؟ چار دنوں میں سب کام پورا ہونا چاہیے۔ مسز سونک، یو آر سینئر۔ آئی نو، یو مسٹ کم فارورڈ ٹو شیئر دی رسپانسبلیٹی۔''

باس کی کیبن سے باہر آنے کے لیے دروازہ کھولا تو سامنے ہر شے دانت دکھا رہا تھا۔ ہر شے یعنی ہنس مکھ۔ مسلسل دانت دکھاتے ہوئے گھومتا ہے۔ اب جو آدھی ادھوری بات سنی ہوگی اسے پورے آفس میں یہ شیطان پھیلائے گا۔

دوپہر میں پان کھا کر منہ لال کر کے آیا ہوا جوشی، جادھو کے ٹیبل پر کھڑے کھڑے طنز کر رہا تھا مجھے دیکھ کر۔ اُرمیلا کو پورا منظر یاد آ گیا۔

''ان عورتوں کے تو مزے ہیں بابا۔ عورت ہونے کے ناتے سبھی کی ہمدردی۔ دیر سے آؤ، جلدی جاؤ۔ وقت پر کام کرو یا نہ کرو۔ بس ذرا سا مسکرا دیا کہ کام ختم۔ پھر باس کو بھی لپیٹ لیتی ہیں یہ۔ سچ مجھے تو بڑا دکھ ہوتا ہے کہ میں عورت کیوں نہیں ہوا۔'' پھر وہ دونوں ہنسے

www.urduchannel.in

لگے۔ مجھے بھی غصہ آ گیا۔ ڈانٹ کر میں نے کہہ دیا۔ ''مسٹر جوشی، کسے سنا رہے یہ سب؟ مجھے؟ میں کسی کی مہربانی پر نہیں جی رہی ہوں۔ کام کرتی ہوں۔ محنت کرتی ہوں۔ دن میں چار چار بار پان کھانے یا چائے پینے نہیں جاتی۔ اور تمہاری طرح دوسروں کو بدنام کرنے میں بھی اپنا وقت نہیں گنواتی، سمجھے؟'' میرا تو پارہ ہی چڑھ گیا تھا لیکن دونوں بڑے بے شرم۔ اتنا سننے کے بعد بھی دونوں دانت دکھا کر ہنستے رہے۔

''میڈم آپ اتنا چڑتی کیوں ہیں؟'' جوشی نے کہا۔ ''میں تو جنرل باتیں کر رہا تھا۔''

''جنرل باتیں! آفس کے بعد کرو جنرل باتیں۔ جاؤ پہلے اپنے ٹیبل پر جاؤ۔''

''اوہ! ساری میڈم، لیکن پرموشن کے آرڈرس ابھی نکلے نہیں ہیں۔ نکلتے ہی شاید آپ باس کے آفس ہی میں.....''

''جوشی.....'' میں نے چلّا کر کہا تب بھاگ کر چلا گیا اپنی سیٹ پر۔ لیکن وہاں سے بھی دونوں میں اشارے ہو رہے تھے۔

پورا دن بے چینی میں گزرا۔ ایک دم خراب دن۔ کیسے ہیں یہ لوگ! اپنی نالائقی پر جھوٹے کمبل اوڑھ کر جھوٹی تسلی پانے والے۔ کیا ملتا ہے انھیں اس سے؟ کیا سچ مچ خوشی ملتی ہے؟ جوشی، کدم، ڈسلوا، راجن میرے ہی آفس کے ساتھی۔ لیکن ان میں سے کسی کو بھی میری طرح کوئی پوچھتا نہیں۔ میں نے کتنی دلچسپی سے سب کام سیکھے ہیں۔ ان ورڈ سے لے کر سیدھے اکاونٹ تک۔ انسپکشن آرڈر آتا ہے تب کیسے سب آگے پیچھے گھومتے ہیں۔ یہ کیسے کیا؟ اس کا سیکشن کہاں ہے؟ اس آڈٹ رپورٹ کا کیا ہوا؟

اُرمیلا کا آفس میں جو مقام تھا اسے سمجھانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے وہ مقام حاصل ہوا تھا اس کی اپنی محنت، لگن اور ہمت کی بدولت۔

''بہورانی'' سسر جی کی آواز سن کر اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹا۔

''آ رہی ہوں۔'' جلدی جلدی ہاتھ منہ دھو کر ہاتھ پونچھتے پونچھتے وہ باتھ روم سے باہر نکلی۔

''چائے بنا رہی ہو نا؟ تم نے تو پی نہیں ہوگی! یا تم نے پی لی ہے؟''

www.urduchannel.in

گھر آتے ہی کون دینے والا تھا چائے کا پیالہ؟ پھر سسر جی نے ایسا کیوں پوچھا"

"چائے بنا رہی ہوں۔ میں ابھی آئی ہوں۔" اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

چائے کا پیالہ سسر جی کے سامنے رکھ کر وہ خود بھی پاس والی کرسی پر بیٹھ کر چائے پینے لگی۔

"لگتا ہے اویناش نہیں آیا ابھی تک؟" پاپا نے چائے پیتے ہوئے پوچھا۔ اسے لگا کہ ان سے پوچھے کہ کیا وہ کبھی اتنی جلدی گھر آتے ہیں؟ کیا آپ کو معلوم نہیں اوپر سے کل کی چھٹی۔ آدھی رات سے پہلے گھر آئے تو بھی ٹھیک ہے۔ لیکن وہ خاموش رہی۔ بے کار بحث کرنے سے کیا فائدہ؟ لیکن پاپا سے خاموش رہا نہیں گیا۔ "لگتا ہے بچے اسکول سے آگئے ہیں؟"

"جی، جیو آ گیا ہے۔ دیپا نہیں آئی ہے اب تک۔"

"ہاں، ویسے جیو کے آنے کا پتا چلا مجھے کمرے میں۔ روز وہی دھینگا مشتی۔ اسے دودھ اچھا نہیں لگتا ہے نا؟ روز نئی چیزیں چاہیے کھانے میں۔ بوڑھی دادی کا کچھ خیال ہی نہیں۔ کیسے کرے گی وہ یہ سب کچھ؟ زندگی بھر اپنی گرہستی چلاتی رہی۔ کتنی تکالیف اٹھائی ہیں بے چاری نے۔ سوچا تھا اب تو فرصت ملے گی۔ لیکن نہیں۔ کسی کسی کا نصیب ہی ایسا ہوتا ہے۔ جانے دو۔" پاپا جی نے کہا۔

ان کی آہیں بھرنے کی عادت سے وہ واقف تھی۔ لیکن آج اسے ان کا بولنا اچھا نہیں لگا۔ وہ وہاں سے اٹھ گئی۔ ایک کی تنخواہ میں گرہستی نہیں چلے گی یہ جان کر ہی، سوچ کر ہی نوکری پیشہ بہو لائی گئی تھی اس گھر میں۔ نوکری پیشہ بہو نہیں لاتے تو کیا ایک تنخواہ میں گذارا ممکن تھا؟ کیا سبھی کے شوق پورے ہو سکتے تھے اس میں؟ اور کیا یہ کاجو، کشمش، بادام کے لڈو؟ کیا یہ سب کچھ ہو سکتا تھا اکیلے اویناش کی تنخواہ میں اور ان کی پینشن میں؟ اسی لیے تو کوڑے کھا کر دودھ دینے والی گائے چاہیے تھی انھیں۔

اس کے دل میں خیال آیا کہ ایک بار ہمت کر کے پوچھ ہی لوں پاپا سے۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس کے سوالوں کے

www.urduchannel.in

جواب کسی کے پاس نہیں تھے۔ ہر ایک اپنے اپنے دائرے میں گھوم رہا تھا۔

''ممی مجھے کافی چاہیے۔'' باہر چلاتے ہوئے دیپا اندر آئی۔ ''اچھی بنانا ممی۔ ایک دم کڑک۔ جھاگ والی اور ہاں ممی، کل مجھے تقریر کرنا ہے اسکول میں۔ یوم آزادی کے موقع پر۔ معلوم ہے چیف گیسٹ کے سامنے تقریر کرنا ہے۔'' ٹیبل پر بیٹھ کر دیپا لگاتار بڑبڑا رہی تھی اور اُرمیلا کسی مشین کی طرح کام کر رہی تھی۔ بیچ بیچ میں کچھ بول رہی تھی۔

''ممی مجھے پوائنٹس بتاؤ گی نا؟ نہیں تو ایسا کرو کافی بناتے ہی کہتی جاؤ اچھے اچھے پوائنٹس۔ پھر میں ان کی مدد سے تقریر لکھ لوں گی۔ رات تک اچھی تقریر تیار ہو جائے گی۔ لیکن ممی، قربانی، شہید، زندہ باد، جیل یہ سب گھسی پٹی باتیں مت دہرانا، ہاں۔ سبھی کے منہ سے وہی لاٹھی چارج، مار دھاڑ، گولہ باری، بھارت چھوڑو کی باتیں سن کر کتنا بور لگتا ہے نا۔ کیا یومِ آزادی یعنی صرف خون، آنسو، جیل یہی باتیں ہوتی ہیں؟'' دیپا جوشیلے انداز میں بولے جا رہی تھی۔ دل کھول کر بتا رہی تھی۔ اپنے اور اپنی سہیلیوں کے خیالات۔ مگر اُرمیلا اسے یکسوئی سے دیکھے جا رہی تھی۔

''اوہو! ممی، ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟ کافی بنا رہی ہو نا؟ جلدی بناؤ نا، تاکہ کچھ چستی پھرتی آجائے۔ پھر بعد میں کریں گے آزادی کی باتیں۔ یہ یومِ آزادی یعنی سچ مچ ایک بوریت ہے۔ صبح کی میٹھی نیند چھوڑ کر اسکول جاؤ۔ وہاں گیارہ بجے تک دھوپ میں یا بارش میں کھڑے رہو اور پھر ہنومان کی دم کی طرح لمبا چوڑا بھاشن سنتے رہو۔ چھٹی کی ساری خوشی ختم ہو جاتی ہے۔ آدھا دن تو یوں ہی بے کار نکل جاتا ہے۔ اس سے بہتر تھا وہ کوئی پکچر دکھا دیتے۔''

سچ پوچھو تو اُرمیلا غصّے سے آگ بگولہ ہو رہی تھی۔ آزادی کے بعد جنم لینے والی یہ پیڑھی۔ یہ آزادی کی اہمیت کیا سمجھے گی؟ اس کے دل میں لاوا ابلنے لگا۔ ذہن میں خیالات کی بھرمار ہونے لگی۔ کیا سچ مچ یومِ آزادی کے موقع پر کچھ نئی باتیں پیش کرنی چاہیے؟

دیپا کو کافی دیتے وقت اسے اچانک 'سانے گروجی' کی یاد آگئی۔ آزادی کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنے والے سانے گروجی۔ آزادی ملنے کے باوجود نئی پیڑھی کو برباد

www.urduchannel.in

ہوتے دیکھ کر گرو جی بے چین ہو اٹھے۔ نوجوان اور عوام کا غصہ وہ برداشت نہیں کر سکے۔ ان کا تن بدن جیسے جل اٹھا۔ اور پھر انھوں نے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ کیا بتاؤں اس بچی کو! کیسے کہوں اس دن کی اہمیت کیا ہے؟ اُرمیلا سن ہو گئی۔

''ممی رات کا کھانا ٹیسٹی بنانا۔ صبح کا کھانا ایک دم بے کار تھا۔'' گھر میں قدم رکھتے ہی جیو کا شور غل شروع ہوا۔ بوٹ، موزے، ڈرائنگ روم میں ہی پھینک دیئے۔

''ارے، اپنی چیزیں تو پہلے جگہ پر رکھو۔'' اُرمیلا چلائی

''او ہو ممی کیا مصیبت ہے! تم ہی رکھ دو نا، پلیز۔ مجھے اب جم جانا ہے۔''

''آتے وقت کیسٹ بدل کر لانا بھیا۔'' دیپا نے آرڈر دیا۔ ''میری سہیلیاں آنے والی ہیں کل دوپہر میں۔ بڑھیا پاپ میوزک لانا۔''

''میرا ٹھینگا! میں کیوں جاؤں؟ اتنی ہی فکر ہے اپنی سہیلیوں کی تو خود چلی جانا۔ میرے پاس وقت نہیں ہے۔'' پھر کچھ دیر تک دونوں کی بحث۔ پھر دوڑ بھاگ۔ لیکن جیو کو دیپا پکڑ نہیں سکی۔ وہ تیزی سے بھاگ گیا۔

''ایسا ہی کرتا ہے ہمیشہ۔ کسی کی کچھ سنتا ہی نہیں۔ بد دماغ کہیں کا۔'' دیپا نے غصے سے کہا اور غصے میں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اُرمیلا نے کپڑے بدلے۔ گھر ٹھیک ٹھاک کیا۔ سبزی تیار کی۔ آٹا گوندھ کر رکھا۔ اسی وقت ساس لوٹی۔ ''ہائے، میں تو بے حد تھک گئی۔ ذرا سا چلو تو پیروں میں درد ہونے لگتا ہے۔ اُرمیلا بیٹی تھوڑی سی چائے بنا دے۔ آدھا کپ۔''

سچ پوچھو تو اُرمیلا تنگ آ گئی تھی اور یہ بھی کوئی چائے کا وقت ہے؟ جیسے آدھا کپ چائے بنانے میں کچھ محنت ہی نہیں کرنی پڑتی۔ وہ دل ہی دل میں جھلاتی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ کچھ کہنا ممکن ہی نہیں۔ اگر کچھ کہے گی تو طوفان اٹھے گا اور پورے گھر کا سکون ختم ہو جائے گا۔ اس سے تو بہتر چائے بنانا ہے۔

''ارے، ہاں، ایک بات تو میں کہنا بھول گئی۔'' ساس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

www.urduchannel.in

اُرمیلا کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ اور کیا ہے اب؟ اس نے سوالیہ انداز میں ساس کو دیکھا۔

''کل کی چھٹی ہے نا تمہاری؟''

''چھٹی؟ ہاں ہے، لیکن صبح آفس جانا ہے۔''

''نہیں گئی تو کیا بگڑے گا؟''

''ایسے نہیں چلتا ماں جی، ریکارڈ خراب ہوتا ہے۔''

''یہ ریکارڈ کیا ہوتا ہے؟''

''انکریمنٹ، پروموشن، ٹرانسفر، سبھی اسی ریکارڈ پر منحصر ہوتے ہیں۔''

''ارے باپ رے! کیا الفاظ ہیں ایک سے بڑھ کر ایک۔ ہمارے زمانے میں عورتیں صرف گھر، شوہر، بچے، چولھا، ان کی ہی باتیں کرتی تھیں۔ ساون کے مہینے میں کتنی ساری کتھائیں پڑھتے تھے۔ آج کل برت وغیرہ تو بھول ہی گئے ہیں سب۔'' وہ مسکراتی ہے۔ اسے ڈر لگتا ہے کہ گاڑی اب دوسرے ہی موڑ پر نہ چلی جائے۔ اس لیے وہ فوراً اصل موضوع کی طرف آتی ہے۔

''آپ کچھ کہہ رہی تھیں نا؟''

''ہاں، ہاں یہی کہ آج نندہ ملی تھی راستے میں۔''

''اچھا، کیا کہہ رہی تھیں نندہ جی؟ کیسی ہیں وہ؟''

''کیسی کیا؟ گھر کی چکی چولھے میں برا حال ہوگیا ہے میری بچی کا۔ میں نے اوی سے کہا بھی تھا کہ بھیڑ بھاڑ والے گھر میں مت بیاہو اسے۔ لیکن اس کی قسمت ہی خراب تھی۔''

''پھر کیا کہا انھوں نے؟''

''وہ کیا کہے گی؟ میں ہی کہا اس سے کہ جتن کو لے کر آنا۔ کھانا کھانے کے لیے۔ ویسے تمہاری بھی کل چھٹی ہے نا؟''

اُرمیلا کو لگا کہ وہ زمین پر بیٹھ جائے اور پھر اٹھے ہی نہیں۔ کسی کے ہلانے سے نہ ہلے۔

www.urduchannel.in

''اور ہاں، کل روٹی بنانے والی شانتا بائی بھی آنے والی نہیں ہے۔ صبح ہی بتا کر گئی ہے۔ اسے کہیں دوسری جگہ پر کھانا بنانے کا کام ہے۔ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ ہم گرم گرم پوریاں بنائیں گے۔''

ساس کل کا پروگرام بنا رہی ہے اور اُرمیلا وقت کا حساب لگا رہی ہے۔ آٹھ بجے آفس، یعنی کم از کم سات بجے گھر سے نکلنا ہی پڑے گا۔ پانچ بجے اٹھوں گی تو کم سے کم جانے سے پہلے کو کر تو چڑھا دوں گی۔ یا پھر اس سے پہلے کا ہی الارم لگاؤں؟

نو بجے اویناش آیا۔ پھر چائے، پھر صوفے پر آرام۔ پھر کھانے کے لیے سب کی منت سماجت آخر ساڑھے دس بجے سبھی کا کھانا ہو گیا۔ اس کے بعد کچن کی صفائی کرتے کرتے گیارہ بج گئے۔

وہ کمرے میں گئی تب تک اویناش خراٹے بھرنے لگا تھا۔ کپڑے اِدھر اُدھر پڑے تھے۔ اس نے کپڑے اٹھائے، گھڑی میں چابی بھری۔ الارم لگا کر بستر کے سرہانے رکھا۔ اسی آہٹ سے اویناش جاگ گیا۔ کیا ٹک ٹک ہے! یہ گھڑی سرہانے کیوں رکھی؟ رات بھر نیند نہیں آئے گی۔ پھینک دو اسے ادھر۔''

''لیکن صبح مجھے الارم سنائی دینا چاہیے نا؟''

''تم کیا کمبھ کرن کی بیٹی ہو؟ کیوں نہیں سنائی دے گا؟''

''لیکن گھڑی پاس ہوتی ہے تو اطمینان رہتا ہے۔''

''کیا بچوں جیسی باتیں کر رہی ہو۔ پہلے وہ گھڑی اٹھاؤ وہاں سے۔''

وہ چپ چاپ گھڑی اٹھا کر دور رکھ دیتی ہے۔

''میری پیاری اُرمیلا۔ میری سویٹ ہارٹ۔'' وہ پیار جتانے لگتا ہے لیکن وہ اسے دور ہٹا دیتی ہے۔

''کیا ہوا؟''

''تھک گئی ہوں۔''

''روز ہی تھک جاتی ہو۔ ارے ہاں، اتنی ساری کتابیں کیوں لائی ہو؟''

www.urduchannel.in

''ڈپارٹمنٹل امتحان ہے۔ میں اس میں بیٹھنے والی ہوں۔ سینئر ہوں۔ نہیں تو موقع چلا جائے گا۔''

''یہ سب کس لیے کرنا ہے اب؟''

''کیا مطلب؟ مجھ میں قابلیت ہے، ہوشیار ہوں۔ میں ترقی کا راستہ کیوں نہ اپناؤں؟''

''ضرور باس نے مشورہ دیا ہوگا۔ سالا، اس کا کیا جاتا ہے؟''

''میں نے کسی سے مشورہ نہیں لیا۔ خود پر پورا بھروسا ہے۔''

''لیکن اب کیوں چاہیے تمھیں یہ سارے جنجال؟''

''اس میں جنجال والی کون سی بات ہے؟ میں سبھی کام کر سکتی ہوں۔ پھر اونچے عہدے کی تمنا کیوں نہ کروں؟''

''دیکھو، مجھے تم سے بحث نہیں کرنی ہے۔ تمھیں جو کرنا ہے کرو۔ چاہے تو آسمان کو چھولو۔ میرا کیا جاتا ہے؟ انھیں تو کام کے لیے جانور چاہیے۔'' وہ منہ پھیر کر سو جاتا ہے۔ اُرمیلا بھی خاموش ہوگئی۔ خیالوں کے اژدہام میں کب آنکھ لگی پتا نہیں چلا۔

صبح تو بھاگ دوڑ تھی۔ وہاں کو کر کی سیٹیاں تو یہاں جیو کی این۔ سی۔ سی کی ٹوپی کی تلاش۔ اُدھر اوِیناش کی قمیض کا بٹن غائب۔ پھر سوئی دھاگا ڈھونڈنا اور بٹن لگانا۔ پھر نہانے کے لیے دیر۔

''کل بینک میں گئی تھیں؟'' اوِیناش کا سوال۔

''اوہ، مائی گاڈ۔ بھول ہی گئی میں۔'' وہ شرمندہ۔

''وہ گاڈ کیا کرنے والا ہے اب! تمہارے راستے میں ہی تو بینک ہے۔ لیکن چھوٹے چھوٹے کام بھی نہیں ہوتے تم سے۔'' وہ غرّاتا ہے اور تلملا کر چلا جاتا ہے۔ سوچتا ہے کہ میرا کہا ہوا کام اس نے کیا نہیں۔ اس کا کیا مطلب؟

گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ اس کی گھوڑ دوڑ شروع۔

''ذرا جلدی آؤ گی نہ بہو؟ نندہ آنے والی ہے آج۔ یاد ہے نا؟''

www.urduchannel.in

ہاں، ہاں کہہ کر وہ نکل پڑتی ہے۔ گھر لوٹتی ہے تب نندہ اور جتن آئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں سبھی گپ شپ کر رہے ہیں، ہنسی مذاق چل رہا ہے۔ بچے دھینگا مشتی کر رہے ہیں۔

''کیا بھابھی تمہارا آفس بھی! یوم آزادی کی بھی چھٹی نہیں؟ ہم کبھی کبھار آتے ہیں تو بھی فرصت سے ملاقات نہیں ہوتی۔''

وہ بہ حالت مجبوری ہنس کر اندر چلی جاتی ہے۔ پورا گھر بے ترتیب۔ کوکر کے علاوہ کھانے کی ذرا بھی تیاری نہیں ہے۔ اُرمیلا کمر میں پلّو باندھ کر کام میں جٹ جاتی ہے۔ ہر ایک کی پسند کا خیال رکھ کر چیزیں بناتی ہے۔

''کھانا بہت ہی عمدہ بنا ہے بھابھی جی۔'' جتن بولا۔

''کچھ بھی کہو بھابھی، لیکن تمہارا برا حال ہوتا ہے نا؟'' نندہ اب ہمدردی جتاتی ہے۔

''برا حال تو ہوگا ہی۔ گھر اور آفس دونوں جو سنبھالنا ہوتا ہے۔'' جتن نے کہا۔

'[عورتوں کی تعلیم کی وجہ سے ہی ہوا ہے یہ سب۔ پہلے تعلیم، پھر نوکری، پھر پروموشن کی ہوس بڑھتی ہی گئی ہے ان کی۔ پھر شکایت کس لیے؟'' بیچ ہی میں پاپا نے اپنی آواز نکالی۔

پورا دن نندہ کی بڑبڑ، سسرال کی شکایتیں، اڑوس پڑوس کے بکھیڑے، قسطوں پر ملنے والی ساڑیاں، نئی فلمیں، بے شمار موضوع۔ اُرمیلا ہاں، ہوں کر کے سب سنتی ہے۔ پھر رات کا کھانا کھا کر سب وداع ہوئے۔ جب کمرے میں آئی اویناش کا منہ پھولا ہوا تھا۔

''کیا ہوا؟''

''صبح گھر کیسے آئیں تم؟''

''کیسے؟ کیا مطلب۔''

''آفس سے تم کیسے آئیں؟ یہ پوچھ رہا ہوں میں۔''

''ہاں، ہاں آفس سے نا؟ اسکوٹر پر آئی۔ نند جی آئی تھیں نا کھانے پر۔ گھر میں تو سب کچھ بنانا باقی تھا۔ بس کا انتظار کرتی تو کتنی دیر ہو جاتی۔ اس لیے دیشپانڈے نے پوچھا تو

www.urduchannel.in

آئی ان کی اسکوٹر پر۔"

"ہاں! اسکوٹر پر، یہی پسند نہیں ہے مجھے۔ تھوڑی دیر ہو جاتی تو پہاڑ نہیں ٹوٹ پڑتا۔ لیکن نہیں، کسی نہ کسی طرح اپنی ماڈرن شان دکھانا ہے نا دنیا کو۔"

"ارے، لیکن....."

"کچھ مت کہو۔ مجھے تمہاری ایک بات بھی سننا نہیں ہے۔" وہ تلملا کر وہاں سے چلا جاتا ہے۔ وہ حیرت میں ڈوب جاتی ہے۔ اس کے اندر آتش فشاں دہک رہا ہے۔ اسے لگا کہ وہ چاروں طرف سے جل رہی ہے۔ جدھر قدم بڑھاتی ہے آگ کی لپٹیں، شعلے، صرف آگ ہی آگ۔ پیروں کے نیچے دہکتے ہوئے انگارے۔ صرف سر پر کھلا آسمان۔ آندھی اور بادلوں سے گھرا ہوا۔ آگ کو مزید بھڑکانے والا۔ اس حالت میں اسے ماں یاد آتی ہے۔ پیار، محبت، شفقت کرنے والی، ممتا لٹانے والی اور ایک محفوظ گھر۔ چار دیواروں سے گھرا ہوا۔ ایک دوسرے پر اعتماد کرنے والا۔ پیار سے ہرا بھرا۔ آنگن میں رنگولی بناتے وقت ماں کے راگ بھوپالی سے گونجتا ہوا۔

یکا یک اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔ اسے ایسا لگتا ہے کہ وہ بہت دور چلی آئی ہے..... بہت ہی دور..... جہاں سے لوٹنا اب ممکن نہیں

☆☆☆

www.urduchannel.in

اذان

ولاس موہیتے

پتھروں کی مدد سے تحصیل آفس کے چاروں طرف کمپائونڈ بنا ھوا،اور اس کے احاطے میں پولیس اسٹیشن بھی۔پولیس اسٹیشن کے سامنے کافی اونچا وائرلیس کا ٹاور،اس ٹاور کے سامنے تقریباً دو سو فٹ کی دوری پر مسجد،مسجد کا بھی ایک اونچا مینار اذان دینے کے لئے موجو دتھا۔اسی مینار سے کریم ملّا اذان دیتے۔دونوں ھاتھ کانوں کے پاس رکھ کر فجر،ظھر،عصر،مغرب اور عشاء کی اذان پابندی سے دیتے۔لائوڈ اسپیکر چھوٹا ھونے کے باوجود اذان کی آواز دور تک جاتی........اللّٰہ اکبر.....اللّٰہ اکبر.....لاالہ الا اللّٰہ۔

پولیس اسٹیشن کے سامنے مسجد کے بازو میں پولیس انسپکٹر کا بنگلہ تھا۔تبادلہ ھو کر جب سے

www.urduchannel.in

میں یہاں آیا ہوں روزانہ اذان کی آواز سن رہا ہوں۔ صبح سویرے پونے چھ بجے کے قریب ماحول کے سناٹے کو توڑتی ہوئی اذان کی آواز گونجتی۔ کھڑکی میں سے دیکھنے پر کریم ملاّ کی سفید داڑھی پہلے دکھائی دیتی۔ قد آور کریم ملاّ مینار پر چھوٹے سے دکھائی دیتے۔ سفید پائجامہ ،سفید کرتا اور سر پر جالی دار ٹوپی، یہی ان کا لباس تھا۔

وہ مسجد کے احاطے میں ہی رہتے۔ ڈھائی سو روپے ماہانہ تنخواہ۔ بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک لڑکا بشیر، گورا چٹا تھا۔ روزانہ کالج جاتا۔ کریم ملاّ پولیس اسٹیشن نزدیک ہونے کی وجہ سے ہمارے پاس اکثر آتے رہتے۔ تقریباً سبھی پولیس والے ان کے دوست تھے۔ ''لڑکا کالج میں پڑھتا ہے''۔ یہ بات سبھی کو فخریہ انداز سے بتاتے۔ ان کی اردو پر مراٹھی زبان کا اثر زیادہ تھا۔

''وہ کیا ہے صاحب، بشیر کی پڑھائی ادھر برابر نہیں ہوتی، اس لئے میں نے ہی کہا، تو ذاکر حسین بورڈنگ میں جاکر بیٹھا کر۔ جماعت کا بورڈنگ ہے پیسا ویسا لگتا نہیں''۔ کریم ملاّ ایک دن مجھ سے کہہ رہے تھے میں کام میں مصروف تھا۔ پھر بھی خالی پیلی گردن ہلا رہا تھا۔

''ایک بات پوچھوں صاحب؟''

''پوچھئے''۔

''انسپکٹر بننے کے لیے کتنا سیکھنا پڑتا ہے؟''

''گریجویٹ ہونا ضروری ہے''۔

''ابھی لڑکا ایف وائے میں ہے اور تین سال لگیں گے نا صاحب!''

''ہاں''

بیٹے کو پولیس انسپکٹر بنانا ہی ان کی زندگی کا واحد مقصد تھا۔ پہلی بیوی مرنے کے بعد انھوں نے شادی نہیں کی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا بنا کر بیٹے کو کھلاتے۔ مالی حالت بہت کمزور تھی۔ کبھی کبھی فیس کے لیے مجھ سے پیسے بطور قرض لے جاتے۔ مگر وعدے کے مطابق لوٹا بھی دیتے۔

www.urduchannel.in

ایک دن وہ بیٹے کو لے کر میرے گھر آئے۔ ''صاحب کو سلام کرو''۔ اپنے بیٹے سے انھوں نے کہا۔ بیٹے نے مجھے سلام کیا۔

''صاحب، یہ ہے میرا لڑکا۔''

''اچھا، اچھا۔''

''اونچائی برابر ہے نا؟'' وہ پولیس میں بھرتی ہونے کے لیے کم از کم اونچائی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔

''برابر ہے۔''

''اور کیا کرنا پڑے گا صاحب؟''

مجھے ہنسی آ گئی۔ اس قدر مقابلہ آرائی کے باوجود ایک مئوذن بیٹے کو انسپکٹر بنائیں گے؟ لڑکا ہوشیار ہے یا نہیں؟ کریم ملاّ تو سیدھے سادے تھے۔ ان کا بیٹا خاموش کھڑا تھا۔

''اور کیا کرنا پڑے گا صاحب؟''

''روز صبح رننگ (Running) کرنا پڑے گی۔ فیزیکل تندرستی کا ٹیسٹ ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''سن لو، صاحب کیا بولتے ہیں۔ روز سویرے جلدی اٹھ کر دوڑنے کے لیے جایا کرو۔ سمجھ گئے؟'' ان کے لڑکے نے گردن ہلائی۔

اس پولیس اسٹیشن میں کام کرتے ہوئے جیسے جیسے دن گزرتے گئے، ویسے ہی کریم ملاّ کی سادگی مجھ پر عیاں ہوتی گئی۔ کچھ پولیس والے انھیں درمیان میں بٹھا کر اکثر مذاق اڑایا کرتے تھے اور وہ صرف ہنستے رہتے۔ ''آپ اپنے بیٹے کو صرف انسپکٹر ہی کیوں بنا رہے ہیں؟ اسے تو سیدھے ڈی ایس پی (DSP) بنائیے۔'' کوئی پولیس والا کہتا ''ہمارے مالک اندر بیٹھے ہیں، وہ اسے ڈی ایس پی بھی بنا سکتے ہیں۔'' اور اس جملے پر سب پولیس والے ہنس پڑتے۔

ایک دن پولیس والوں کو بلا کر میں نے خوب ڈانٹ پلائی۔ ''کریم ملاّ کا مذاق کیوں اڑاتے ہو؟ اپنے بیٹے کو انسپکٹر بنانے کی ان کی ضد ہے۔ لڑکا تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ ان کی قسمت کا حال تمھیں معلوم ہے؟''

www.urduchannel.in

وقت کا پہیہ برابر گھوم رہا تھا۔ اذان بھی پابندی سے دی جارہی تھی۔ میرے دن کی شروعات صبح کی اذان سے ہوتی۔ اذان کی آواز دل پر دستک دیتی۔ اللہ کا نام صبح صبح بڑا پیارا لگتا۔ کبھی کبھار سماعت پر گراں بھی گزرتا۔ جس طرح سے کالی داس کے اشلوک سن کر مجھے جھرجھری آجاتی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ شکنتلا اور مسجد کا تعلق میری سمجھ سے باہر تھا۔

اگست کے مہینے میں مسلمانوں کے محلوں میں جگہ جگہ تعزیے اور پنجے بٹھائے گئے۔ ہر ایک محلے سے اگربتیوں کے خوشبو آرہی تھی۔ شہادت کی رات آئی۔ مسلمان دولھادولھا کرتے ہوئے تمام رات سواریاں اور پنجے اٹھاتے رہے۔ پولیس کا بھرپور بندوبست تھا۔ ان پنجوں سے حسنؓ، حسینؓ کی یاد تازہ کرنا تھی۔ حسنؓ حسینؓ پیغمبرؐ کے نواسے تھے وہ جہاد میں شہید ہوئے تھے۔ اسی لیے ان یاد میں تعزیے اٹھائے جاتے ہیں۔

یہ شہادت کی رات پولیس والوں پر بھاری رہتی۔ پولیس والے خود کو مقتل میں کھڑے ہوئے سمجھتے۔ ہر سال کی طرح آنکھوں میں تیل ڈال ڈال کر مجمع کے ساتھ گھومتے رہتے۔ مجمع جب ہندوؤں کی گلی میں داخل ہوتا تو پولیس والوں کو سخت ہوشیار رہنا پڑتا۔ اس وقت تقاروں اور تاشوں کی آواز بھی بڑھ جاتی۔

صبح نہادھو کر دوبارہ ۱۱ بجے تک پولیس والوں کو تروتازہ ہوجانا پڑتا۔ پھر محرم کا جلوس شروع ہوجاتا۔ لاٹھی ڈھال وغیرہ کی کرتب بازی شروع ہوجاتی۔ بڑے چوراہے پر لاٹھی گھمانے کی زیادہ نمائش ہوتی۔ کوئی سوئیوں کا کوڑا اپنی پیٹھ پر مارتا تو اس جگہ بھیڑ بہت زیادہ ہوجاتی۔ پھر آہستہ آہستہ جلوس ندی کی جانب چل پڑتا۔ وہاں ایک ایک سواری، پنجہ ٹھنڈا ہوتا رہتا۔ دن ڈھلنے تک تمام ٹھنڈے ہوجاتے۔ ندی کنارے بھی پولیس والے چوکس رہتے۔

ندی کنارے کریم ملاّ دکھائی دیے۔ وہ بھی جلوس میں شامل تھے۔ مجھے دیکھ کر انھوں نے سلام کیا۔ نزدیک آکر کہنے لگے ”صاحب یہ خوشی کا دن نہیں ہے۔ جوان لڑکے ناچتے ہیں، گاتے ہیں۔ مجھے بالکل پسند نہیں۔ آج تو ماتم کا دن ہیں۔ ابھی لڑکوں کا خون گرم ہے۔ عقل کم ہے اور جوش زیادہ ہے نا صاحب! ہم جیسے بوڑھوں کی بات کون سنتا ہے؟“ میں ان کی تمام باتیں سنتا رہا۔ سبھی سواریاں، پنجے اور تعزیے ٹھنڈے ہوگئے۔

www.urduchannel.in

اب پندرہ دن کے بعد گنپتی کا تہوار شروع ہو جائے گا۔ انھیں بھی اسی جگہ پانی میں ڈبویا جائے گا۔

ہر سال کی طرح لوٹتے ہوئے مسلمان الوداع.....الوداع غمگین آواز سے کہتے جا رہے تھے۔ میں نے کریم ملا کی جانب دیکھا وہ بھی اونچی آواز سے الوداع.....الوداع کہتے ہوئے اپنے آپ میں گم تھے۔

محرم کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے گنپتی آ گئے۔ سارے شہر میں لاؤڈ اسپیکروں کا شور شرابہ شروع ہو گیا۔ پولیس کا بندوبست بڑھ گیا۔ غنڈوں، بدمعاشوں کو تڑی پار کے آرڈر دیے گئے۔ کچھ سیاستداں ناراض بھی ہو گئے۔ چند ایک گنپتی منڈلوں نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے گنپتی ہی نہیں بٹھائے۔ پولیس کے خلاف اخبارات میں مختلف خبریں شائع ہوئیں۔ ہر سال کی طرح امن کمیٹی کی میٹنگیں ہوئیں۔ ہندو مسلم ممبران شریک ہوئے۔ امن کا وعدہ کر کے لوٹ گئے۔ ایس آر پی بھی آ گئی دس دن ختم ہونے پر گنپتی کا جلوس شروع ہوا۔ پچھلے سال کی طرح شراب پی کر جلوس میں لاتعداد لوگ تھے۔ ہر گنپتی کے سامنے بینڈ بجا لیزم موجود تھے۔ ہر ایک گنپتی کے سامنے اسی گلی اور محلے کے لوگ مستی میں ناچ رہے تھے۔ جلوس کی رفتار بہت سست تھی۔ جلوس کو آگے ڈھکیلنے کا کام پولیس کے ذمے تھا۔ ''ہمیں اس چوراہے پر ناچنے دیجئے، اس چوراہے پر ناچنے دیجئے۔'' مختلف منڈل کے لوگ ڈیمانڈ کرنے لگے۔ کسی سے لاؤڈ اسپیکر کی آواز کم کرنے کے لیے پولیس والے کہتے تو وہ فوراً جواب دیتا۔ ''تمہیں مسجد پر لگا ہوا لاؤڈ اسپیکر دکھائی نہیں دیتا، ہمیں کیوں منع کر رہے ہو۔ پہلے وہ بند کرو۔'' یہ آواز انسان کی نہیں شراب اور نفرت کی تھی۔

سالِ گذشتہ کی طرح کوئی بھی مسلمان سڑک پر نہیں آیا۔ جلوس کو جاتے ہوئے وہ گھروں کی چھت پر سے یا پھر دروازوں کی دراڑوں سے دیکھ رہے تھے۔ سارے آدمی، پولیس والے اور راستے گلال سے لال ہو گئے تھے۔ کلکٹر، ڈی ایس پی، نہرو چوک میں تھے۔ ضلع مجسٹریٹ لال سرکل میں موجود تھے۔ وائرلیس کی گاڑیاں شہر کے مختلف ٹھکانوں پر موجود تھیں۔ واکی ٹاکی اہم افسران کے ہاتھوں میں دیئے گئے تھے۔ کال پر کال شروع

www.urduchannel.in

تھیں۔کالنگ اپیل، کالنگ بیکس، کالنگ جاری.....جلوس کی لمبائی تقریباً ڈیڑھ کلو میٹر ۔دوسو گنپتی۔انھیں ڈبونے کا وقت صبح سات بجے۔سادہ لباس میں پولیس والے شہر میں پھیلے ہوئے تھے۔ان سے اندرونی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔

ایک سادہ لباس پولیس مین نے میرے قریب آ کر کہا،''صاحب! نہرو چوک میں گڑبڑ ہوگی۔جے جوان گنپتی منڈل کے گنپتی پر نہرو چوک میں پتھر پھینکے جائیں گے۔''

''کیا وجہ ہے؟''

''رَدیوار پیٹھ کے جوانوں کو آپ نے نوٹسیں دی ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ جے جوان منڈل والوں نے ہمارے خلاف گواہیاں دی ہیں۔اسی لئے وہ نہرو چوک میں فساد برپا کردیں گے۔''

''کالنگ بیکر، کالنگ بیکر''

''بیکر ریپلائنگ''

''جے جوان منڈل کہاں ہے؟''

''نہرو چوک کے نزدیک آ گیا ہے صاحب۔''

''کالنگ کنٹرول، نہرو چوک میں ایکسٹرا فورس بھیجئے۔ایس آر پی پلاٹون بھیجئے۔''

''صاحب، جلوس میں سے گزرنے کے لیے راستہ نہیں۔گاڑی نہیں جا سکتی۔''

''گھاٹ پر موجود پلاٹون کو نہرو چوک میں آنے کے لیے کہیے۔''

''یس سر۔''

''ساتھ میں آنسو گیس بھی بھیجئے۔''

جب تک یہ دستہ نہرو چوک پہنچتا، وہاں سنگ باری شروع ہو چکی تھی۔پولیس والوں کے ہیلمیٹ پر بھی پتھر گر رہے تھے۔تین چار ہزار لوگ اس میں شریک تھے۔اینٹوں اور پتھروں کی بارش سے کلکٹر صاحب کی جیپ کی شامت آ گئی۔پولیس والے نے جیپ پر سے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے امن اور شانتی کی اپیل کی۔بار بار اپیل کی۔مگر بے سود۔آنسو گیس چھوڑی گئی ۔آنکھیں جلتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔سب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ہوا کا رخ بدلنے

www.urduchannel.in

پر پولیس والوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات شروع ہوگئی۔اور پھر لاٹھی چارج کا حکم دے دیا گیا۔مگر اب کی بار پولیس پر سنگباری شروع ہوگئی۔سارے شہر میں فساد پھوٹ پڑا ۔جہاں بھی پولیس والے دکھائی دے رہے تھے انھیں نشانہ بنایا جارہا تھا۔جہاں پولیس کی طاقت کم نظر آتی تھی وہاں تلوار سے بھی حملے شروع ہوگئے۔

ایکسٹرا ایس آر پی آئی۔زوردار لاٹھی چارج شروع ہوگیا۔سر پھوٹ کر،خون گلال میں شامل ہورہا تھا۔جنونی لوگ ایسڈ بلب پھینکنے لگے۔مزید ایس آر پی بلائی گئی.....ہاتھ پیر فریکچر ہونے لگے۔کلکٹر صاحب ہیلمیٹ لگائے کھڑے تھے مگر فساد قابو میں نہیں آرہا تھا۔زوردار لاٹھی چارج ہونے کی وجہ سے مجمع تتر بتر ہوگیا۔مگر مختلف ٹولیوں کی شکل میں شہر میں دکانوں کی توڑ پھوڑ کرنے لگا۔یہ دیکھ کر کلکٹر صاحب نے گولی باری کا حکم دے دیا۔

''کالنگ بیکر،کالنگ بیکر۔''

''بولیے۔''

''صاحب منڈی کے چوراہے پر فسادیوں نے حملہ کردیا۔''منڈی چوکی کے ہیڈ کانسٹبل نے اپنی حفاظت کے لیے گولی چلادی۔ایک آدمی ہلاک ہوگیا۔''

''کالنگ کنٹرول۔منڈی چور ہے پر فورس بھیجیے۔میں بیکر بول رہا ہوں۔''

''یس سر۔''

''کالنگ ڈیلٹا۔باڈی ہسپتال لے کر جایئے۔''

''یس سر۔''

میں کلکٹر صاحب کے پاس گیا۔''سر منڈی کے نزدیک فائرنگ میں ایک آدمی ہلاک ہوگیا۔''

کلکٹر صاحب نے کندھے اچکائے اور کہا۔''اِٹس آل رائٹ۔''

فساد آہستہ آہستہ قابو میں آتا جارہا تھا۔دواخانے میں موجود کانسٹبل کا مجھے فون آیا۔

''سر،لاش ایک مسلمان کی ہے۔''

www.urduchannel.in

''مسلمان؟''

''جی ہاں سر، اپنے کریم ملا کا بشیر۔''

میں ایک دم لرز کر رہ گیا۔ بلڈ پریشر لو ہو گیا۔ آواز بھاری ہو گئی۔ پھر بھی میں نے پوچھا۔

''تم پورے یقین کے ساتھ کہہ رہے ہو؟''

''اپنے کریم ملا کے بشیر کو کون نہیں پہچانتا ہے صاحب۔''

''وہ منڈی کے پاس کیسے آ گیا؟''

اس کا دوست محبوب بھی ساتھ ہے، اس نے بتایا: ''کرشن ناکے سے اسٹیشن کی طرف دونوں رنگ کے لیے جا رہے تھے۔ یہ دونوں کا معمول تھا؟''

''رنگ!''

''ہاں صاحب۔''

میں نے فون نیچے رکھا۔ ہندو ہندو کے فساد میں ایک بے گناہ مسلمان ہلاک ہو گیا۔ پولیس انسپکٹر بننے کے لیے صبح سویرے رنگ کے لیے نکلنے والا نوجوان۔ میری آنکھوں کے سامنے کریم ملا کا سادگی سے پر چہرہ آ گیا۔

میں نے ڈی ایس پی اور کلکٹر کو اس حادثے کے بارے میں بتایا۔ کوئی غلطی سے ایک بے گناہ مسلمان کو لگ گئی۔ دونوں کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اب کی بار کلکٹر صاحب نے کندھے نہیں اچکائے۔ دونوں فکر مند ہو گئے۔ اب مسلمانوں کو غصہ آ گیا تو؟ فرقہ وارانہ فساد۔ ان کے سوچنے کا انداز بدل گیا۔ سارے افسران ڈی ایس پی کے پاس جمع ہو گئے تھے۔ سبھی کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ اب اگلا ایکشن پلان کیا ہونا چاہیے؟

تین چار مسلم پی ایس آئی بھی تھے۔ ان سے مشورہ کیا گیا۔

''صاحب ہم مسلمان لیڈروں کو بلا کر حالات کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

عباس بیگ، عثمان ملانی، عبدالغنی، داؤد شیخ، اور رسول شیخ، ان لیڈران کو پولیس جیپ کے ذریعے پولیس اسٹیشن لایا گیا۔

www.urduchannel.in

میں نے گھڑی دیکھی، صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔

''کیا ہوا صاحب؟ کچھ لفڑا ہے کیا؟'' عباس بیگ نے پوچھا۔

مَلانی نے کہا، ''وہ کیا ہے کہ..... فساد شروع ہوا تو پولیس نے فائر کر دیا۔''

''پھر.....''

''گولی اپنے کریم مَلا کے بیٹے کو لگی اور وہ ہلاک ہو گیا۔''

سب جیسے پتھر کے بن گئے، بالکل مورتی کی طرح۔

''یا اللہ کریم کو کسی نے بتایا بھی یا نہیں؟'' عباس بیگ نے کہا۔

''بتائیں گے؟ لیکن کیسے بتائیں گے؟ بعد میں انھیں بتانا تو ہے ہی۔''

مَلانی نے عبدالغنی کی طرف دیکھ کر کہا، ''عبدل بابو، آپ جا کر بتائیں گے؟''

عبدالغنی نے گردن جھکا لی۔ سبھی کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ سبھی مٹی کے پتلے بن گئے تھے۔ ذرا بھی حرکت نہیں ہو رہی تھی۔ کریم مَلا سے یہ سب بتانے کی ہم میں بھی ہمت نہیں تھی۔

صبح کے پونے چھ بج گئے۔ کریم مَلا مسجد کے چبوترے پر آئے۔ ہمیشہ کی طرح جالی دار سفید ٹوپی پہنے ہوئے مینار پر چڑھے۔ دونوں ہاتھ کانوں کے نزدیک لے جا کر انھوں نے اذان دینا شروع کی۔ اللہ اکبر..... اللہ اکبر.....

کریم مَلا سے میں نے باتوں باتوں میں ایک مرتبہ فجر کی اذان کا مطلب پوچھا تھا۔ انھوں نے تفصیل سے اس کا مطلب بتایا تھا۔ فلاح کی جانب آیئے اور نماز نیند سے بہتر ہے۔ ان دو جملوں نے میرے ذہن کی بے شمار پرتوں کو کھرچ ڈالا تھا۔ آج مجھے بے حد احساس ہو رہا ہے کہ نہ تو ہم نے آج تک فلاح کا راستہ اختیار کیا اور نا ہی ہم ابھی تک نیند سے جاگے ہیں۔

اذان کی آواز سناٹے میں بکھر رہی تھی، اس کے ساتھ ہی کریم مَلا کی زندگی کا مقصد بھی تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ میں نہیں جانتا یہ کب تک تحلیل ہوتا رہے گا۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

اندھیرا، اُجالا

انورادھاویدیہ

کُمود نے ٹفن تیار کیا۔باسکیٹ میں تولیہ ،تھرماس،پھل ،ٹفن وغیرہ سب ڈھنگ سے رکھا۔اسے اٹھا کر وزن کا اندازہ کیا۔باسکیٹ کافی بھاری ہو گیا تھا۔ایک تھیلی میں اس نے چادریں ،کورس اور شال رکھی۔پرس میں پیسے اور رومال رکھا،سبھی سامان پر نظر دوڑائی کہ کہیں کچھ رہ تو نہیں گیا۔پھر اس نے کپڑے تبدیل کیے۔سامان اٹھا کر وہ بیچ دروازہ کے پاس کچھ پل کھڑی رہی۔پھر اندر کی تاریکی میں جھانکتے ہوئے اس نے آہستگی سے کہا'میں اسپتال جارہی ہوں'

"سنبھل کر جانا۔کولھو کے بیل کی طرح گھوم رہی ہو۔اسپتال کے چکر،باہر کا کام،رت جگا،ہاتھ بٹانے والا کوئی بھی نہیں۔"

www.urduchannel.in

''چلتی ہوں''اندھیرے میں باتیں کرتے ہوئے بڑی لماں سے اس نے کنی کاٹی۔آج کل کسی کی بھی ہمدردی اسے اچھی نہیں لگتی تھی۔ادھر کونے میں کھڑکی کے پاس پڑی کرسی پر بڑے بھیا بیٹھے تھے۔اس نے بغیر آہٹ کے پیروں میں چپل ڈالی تاکہ انھیں معلوم نہ ہو۔پھر بھی اس کی موجودگی کا احساس ہو ہی گیا۔انھوں نے جیسے ہوا میں ایک سوال اُچھالا۔''کون؟''

''میں ہوں کمود۔''

''اسپتال جارہی ہو؟''

''جی،کھانا پہنچانا ہے۔''

''سنبھل کر جانا۔موٹروں ،بسوں ،گاڑیوں کی ریل پیل،جانوروں کا کھلا بھٹکنا،بھئی آج کل پیدل چلنا دوبھر ہوگیا ہے۔تمھارے ساتھ آنا چاہتا ہوں میں مگر کیا کروں؟لاچار ہوں،نابینا.....میرے ساتھ چلنے سے تمھاری پریشانی بڑھ جائے گی۔''

''ویسے ضرورت نہیں ہے بھیا۔آپ فکر نہ کریں۔''

''تم نے اتنی ہمت اٹھائی ہے چھوٹی بہو۔کتنی دوڑ دھوپ،پریشانی اٹھانی پڑتی ہے تمہیں''

''اب اجازت دیجیے بڑے بھیا۔دیر ہورہی ہے۔''

اپنی لاچاری کے لیے بڑے بھیا کو افسوس ہوا۔صحیح سلامت ہوتے ہوئے بھی نابینا ہونے کی وجہ سے اس طرح بے بسی کی زندگی گزارنا پڑرہی ہے۔اچانک انھیں بیوی کے سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی۔بےچینی سے انھوں نے آواز دی''سنتی ہو،ذرا باہر تو آؤ'' اپنا کام چھوڑ کر بڑی بھابھی بھاگی بھاگی آئیں۔''اجی ایسی کون سی آفت آن پڑی ہے۔جو گلا پھاڑ پھاڑ کے چلانے لگے؟طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''بڑے بھیا انھیں سمجھا نہیں سکے۔ان کے دل میں کیسا طوفان اٹھا ہے۔انھوں نے یوں کہہ دیا''کچھ نہیں،کھانا تیار ہوگیا ہو تو لگا دو''

''اونہہ''بڑی بھابھی کی جان میں جان آئی۔کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔بس اتنے سے کام کے لئے سارا گھر سر پر اٹھالیا۔دیکھیے لڑکیاں ابھی اسکول سے آئیں گی۔تب اکٹھا ہی

www.urduchannel.in

کھائیں گے۔ سچن، منّن تو کھا چکے، بہت بھوک لگی ہو تو آپ کو کھانا دوں؟''

''نہیں، نہیں، آنے دو دونوں بچّوں کو، ساتھ ہی کھائیں گے۔ اماں کھا چکیں۔''

''ہاں، کمود کے ساتھ۔ اسے کیا کھانا کہتے ہیں؟ بس یوں ہی منہ جھوٹا کرتی ہیں۔ کمود تو جیسے پھول سونگھتی ہے۔ بھگوان جانے اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے؟''

''کون کس کی قسمت کو کوسے بھگوان؟''

''روز روز اسپتال کے چکر کاٹ کاٹ کر تھک کے چور ہو جاتی ہے بے چاری۔ سنا ہے کل تو.....''

''بس بھی کرو۔ سننے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔''

بڑی بھابھی اندر چلی گئیں۔ بڑے بھیا کا دل پھر ادھر اُدھر بھٹکنے لگا۔ کاش کوئی آ جائے اور پربھا کر کے اچھے ہونے کی خبر دے کر کانوں میں امرت گھول دے۔ کاش ایسا عجوبہ ہو اور میری آنکھیں واپس آ جائیں، کسی جادوئی چھڑی سے میں پھر سے دیکھ سکوں۔ ڈاکٹر نے ایک بار ایسا ہی کچھ کہا تھا۔ کمود بتا رہی تھی، ''کسی کے آنکھیں دینے سے اندھا انسان دیکھ سکتا ہے۔ دو سال پہلے اسی طرح چھائے اندھیرے کا خول توڑ کر روشنی میں سما جائے۔ اس کے بعد تو وہ پھر سے دکان، گھر بار کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے گا۔ اس کی جتنی بھی زندگی باقی ہے آرام سے کٹے، اسے سکون ملے۔ معذور اماں جو پکے ہوئے پان کی طرح ہے، نابینا بھائی کا خاندان، اپنا خاندان سبھی کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا اٹھا کر پربھا کر تھک گیا ہے۔ اپنے اور بڑے بھیا کے بچّوں میں کبھی اس نے تفریق نہیں کی۔ چپ چاپ اپنی ذمہ داریاں اٹھاتا رہا۔ آج جب وہ زندگی کے آخری دن گن رہا ہے اب بھی کیا وہ گھریلو فکروں سے آزاد نہیں ہو سکتا؟ وہ بیماری سے لڑ رہا ہے اور ہم بیکار بیٹھے ٹکڑے توڑ رہے ہیں۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے گھر میں بیٹھے ہیں۔ مفت کی روٹیاں توڑتے ہوئے۔ یہ خیال آتے ہی بڑے بھیا شرم سے پانی پانی ہو گئے۔ وہ خود کو اور بھی کمزور اور لاچار سمجھنے لگے۔

اسپتال کی پہلی سیڑھی کے پاس کمود ذرا رک گئی۔ نظر اٹھا کر اس نے ایک بار سیڑھیوں کا اندازہ کیا۔ چوتھی منزل کی سیڑھیاں طے کرنے کے بعد اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ پربھا کر کے

www.urduchannel.in

کمرے میں پہنچتے ہی اس نے پہلے سامان نیچے رکھا۔ اپنا پسینہ پونچھا۔ دو پل پھولی ہوئی سانسیں درست کرنے کے لیے وہ پربھاکر کے پلنگ کے کنارے بیٹھ گئی۔ پربھاکر کو اپنی جانب ٹکٹکی باندھے، نم ٹماتی ہوئی امید بھری نظروں سے دیکھتے ہی وہ چونک پڑی۔ جھٹ سے اٹھ کر وہ اس کے کنارے آ گئی اور اس پر جھکتے ہوئے اس نے پوچھا، ''بھوک لگی ہے نا؟ چلو کھانا لگا دیتی ہو۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنا سر ہلایا۔ پربھاکر کا دل بھر آیا۔ کام پر جاتا تھا تو کھانا نکال کر اس کے انتظار میں آنکھیں بچھائے بیٹھی رہتی تھی۔ چار چار بار دکان میں فون کرنا پڑتا تھا۔ کھاتے وقت بھی دونوں بھائیوں کا آپس میں صلاح و مشورہ کا سلسلہ جاری رہتا۔ ''پربھاکر جلگاؤں کی پارٹی کا پیمنٹ کیا؟'' ''جی بڑے بھیا، مگر کیوں پوچھ رہے ہیں آپ؟''

''پوری پیمنٹ پہلے ہی نہیں کرنا۔ پہلے مال آنے دو۔ ہماری اچھی خاصی ساکھ ہے ان کے یہاں۔ آدھا پیسہ بھی دیتے تو بہتر تھا۔''

''مگر وہ لوگ پوری پیمنٹ کی درخواست کر رہے تھے۔''

''پھر بھی۔ جب تک پورا مال نہیں ملتا، پوری پیمنٹ نہیں کرنا۔''

''جی بہت اچھا۔''

''نابینا ہوئے تو کیا، بڑے بھیا کا سارا دھیان دکان کی جانب رہتا۔ پربھاکر سے دکان کے ایک ایک پل کا لیکھا جوکھا لے لیتے، حساب کتاب کی کتر بیونت میں لگے رہتے۔ پربھاکر کو مشورے دیتے۔ وہ بھی ان کے مشورے سر آنکھوں پر رکھتا۔

اسی وقت کمود کا دل بڑے بھیا کے لیے ہمدردی سے بھر آتا اور پربھاکر کی وجہ سے اس کا سر اونچا ہو جاتا۔ اس کا برتاؤ سمت اور چاہت کی وہ داد دیتی۔ اتنی چھوٹی عمر میں اس نے کاروبار کی باگ دوڑ سنبھالی۔ اتنے بڑے خاندان کا وہ کرتا دھرتا بن گیا۔ اندھے کی لاٹھی بنا۔

آج کس طرح وہ لاغر کمزور ہو گیا ہے۔ اسے کھانا بھی وہ اپنے ہاتھوں سے کھلاتی ہے۔ دل میں امڈتے ہوئے سارے خیالوں کو دور کر کے اس نے اسے بٹھایا۔ اس کی پیٹھ کے ساتھ نرم نرم تکیے لگائے۔ سینے پر نیپکین رکھا اور دال چاول ملا کر چمچے سے کھلانے لگی۔ ایک فرمانبردار بچے کی طرح وہ کھانا کھانے لگا۔ اسے پانی پلا کر اس نے پوچھا، ''سونا

www.urduchannel.in

چاہتے ہو؟"

"نہیں تھوڑی دیر بیٹھوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔تو میں تھوڑا سا آرام کرلوں؟" پاس والے پلنگ پر وہ لیٹ گئی۔اس کی آنکھ لگ ہی رہی تھی کہ پربھا کرنے پوچھا، "دکان سے کوئی آیا تھا؟"

"ہاں گلگرنی آتے ہیں ہر روز۔"

"بڑے بھیا کو حساب دے دیتے ہیں نا؟"

"ہاں"

"ٹھیک ہے۔کم از کم وہ تو ایک بھروسے کا آدمی ہے۔بڑے بھیا ویسے.....میری حالت ایسی.....گلگرنی نہ ہوتا تو مشکل ہوجاتی۔" اس نے دیکھا وہ گہری نیند میں کھوگئی ہے۔وہ بہت کچھ کہنا سننا چاہتا تھا۔کھیتی باڑی کا حال، بچوں کے بارے میں.....سب دل ہی میں رہ گیا۔بے چاری بہت تھک گئی ہے۔تن سے من سے ٹوٹ چکی ہے۔مگر مشکلات کا پہاڑ ٹوٹنے پر بھی اس کی نیند نہیں اڑی۔سچ ہے مصیبتوں کی عادت پڑنے سے ہم سہنے کے عادی بن جاتے ہیں۔کمود کو اس سچائی کو اپناتے دیکھ کر پربھا کرنے راحت کی سانس لی۔کچھ بھی ہو اس کی نیند خراب نہ ہو۔اس خیال سے وہ بھی سوگیا۔

شام کے وقت وہ گھر لوٹی۔بچے بیچ والے کمرے میں بڑی للتاں کے پاس پہاڑے یاد کررہے تھے۔بڑی بھابھی کچن میں مصروف تھیں۔بڑے بھیا اسی کرسی پر بیٹھے تھے۔چوکنے، اس کے گھر میں قدم رکھتے ہی انھوں نے پوچھا، "کیسا ہے وہ؟"

ان کے سوال پر دھیان نہ دیتے ہوئے وہ گھر میں آگئی۔نڈھال سی۔کچھ کہنے یا سننے کی قوت کہاں تھی اس میں؟ دن بہ دن اس کی ہمت جواب دینے لگی تھی۔صبر کا باندھ ٹوٹنے لگا تھا۔آنے والا ہر دن اس کی قوتِ ارادی کو نوچ کھسوٹ رہا تھا۔اس کے صبر کی دھجیاں اڑا رہا تھا۔ہمت اور امید کو تار تار کررہا تھا۔منہ ہاتھ دھوکر کچن میں آگئی۔باسکیٹ میں سے سامان نکال کر رکھنے لگی۔بھابھی نے کہا، "رہنے بھی دے تھکی ہوئی ہے۔"

اس نے بھابھی کی جانب دیکھا۔ہمیشہ کمر بستہ کولہو کا بیل بنی بھابھی کی جانب اس

www.urduchannel.in

سے دیکھا نہیں گیا۔ دس لوگوں کا کھانا تیار کرنا، سبھی کی آؤ بھگت کرنا، انھیں پتہ بھی کہاں چلتا ہوگا کب دن شروع ہوا اور کب رات ہوگئی۔

''کوئی کام والی دیکھو نا بھابھی کھانا بنانے کے لیے۔ پورا دن آپ ہی سارا کام کرتی ہیں۔''

''رہنے بھی دے۔ ارے پگلی مجھے کچھ کام بھی ہے، جس سے میں اپنا دل بہلا سکوں۔'' بھابھی کے منہ سے نکل تو گیا، مگر دونوں کو ایسا لگا جیسے مضبوطی سے پکڑا ہوا شیشے کا پیالہ ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اور چور چور ہوگیا۔ بھابھی کے دھنک رنگ اور خواب اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ حساس کمود کا دل چھلنی ہوگیا۔ وہ زیادہ دیر تک بھابھی کا سامنا نہ کرسکی۔ اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔ لیکن بھابھی کا خیال سائے کی طرح اس کا پیچھا کرتا رہا۔ دو دو بیٹیوں کی ذمہ داری اور شوہر کا نابینا پن۔ یہ دُکھ اب کمود نے سمجھ لیا۔ ان بھیانک حقیقتوں نے انھیں سب سے مل جل کر رہنے کے لیے مجبور کیا ہوگا۔

کمرے میں سچن، نتن پڑھ رہے تھے۔ ایک پین کو لے کر ان میں مہابھارت چھڑ گیا تھا۔ لیکن اس کے داخل ہوتے ہی خاموشی چھا گئی۔ وہ ننھے بچے بھی جان گئے تھے کہ ماں بے حد پریشان ہے۔ اسے دیکھ کر دونوں چارپائی سے نیچے اترے سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہوئے سچن نے کہا ''ماں آئی ہونا اسپتال سے؟ آؤ لیٹ جاؤ ادھر، میں نے تمھارے لیے جگہ بنائی ہے۔''

''نتن نے بھی جگہ بنائی ہے ماں۔'' نتن نے کہا۔ سچن نے بڑا پن دکھاتے ہوئے اسے پچکارا۔ ''ہاں بھائی تم نے بھی۔ چلو، اب ماں کو آرام کرنے دو۔ انھیں تنگ مت کرو۔''

اس نے دونوں کا ماتھا چوما اور چپ چاپ زمین پر چٹائی بچھا کر لیٹ گئی۔ وہ دونوں بھی پڑھنے لگے۔ گھر میں ماتم سا سناٹا چھا گیا۔ صرف بڑی لتاں کی کانپتی، تھرتھراتی آواز میں شلوک گھر میں گونجنے لگے۔ پورے گھر پر گہری اداسی کی پرتیں جم رہی تھیں۔ پورے گھر کی امنگ نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ کمود نے سوچا، غم کے سائے سے گھر کا ہر فرد بوکھلا گیا ہے۔ گھر کا ماحول ایسا خوف زدہ ہوا تھا جیسے دھماکے سے پہلے کا سناٹا۔

گھر کا ماحول تبدیل کرنے کے لیے کمود نے اٹھ کر ساری بتیاں جلائیں۔ ٹی وی

www.urduchannel.in

شروع کیا اور سبھی بچوں کو زور سے آواز دی۔ ''آؤ بچو، چتر ہار شروع ہو گیا ہے۔ دیکھنا ہے نہ چلو اٹھو۔''

بچے اس وجہ سے ڈرائنگ روم میں آ گئے جیسے اس کے حکم کا پالن کئے بنا کوئی چارا نہیں۔ وہ خاموشی سے چتر ہار دیکھنے لگے۔ کمود نے بڑے بھیا سے بھی درخواست کی۔ ''سنیے نا بھیا برسات کی رات کا آپ کا من پسند گیت.....''

''اوں..... ہاں، ہاں!'' بڑے بھیا نے جھجکتے ہوئے کہا۔

کچن میں جا کر وہ بڑی بھابھی اور بڑی امّاں کو بھی کھینچ لائی۔ بچوں کا تو دل بہل گیا۔ لیکن بھابھی، بھیا اور امّاں کسی مجرم کی طرح بیٹھے رہے۔ اس ادھار کی خوشیوں سے جیسے تیسے شام کٹ گئی۔ کھانے کے بعد سچن، منن کو سینے سے لگا کر کمود لیٹ گئی۔ آج پھر پربھا کر کے ایک دوست رات اسپتال میں رہنے والے تھے۔ اس لیے بے فکری سے وہ گھر کی چھت کے نیچے سو سکتی تھی۔ آج پربھا کر زندہ ہے اس لیے یہ چھت صحیح سلامت ہے۔ اس کے بعد..... بوڑھی امّاں، اندھے بھیا، ان کا خاندان، ننھے بچے اور بے سہارا بیوہ کمود، جوان خوبصورت۔

ایک عجیب سا خوف اس کے پورے جسم میں سرایت کر گیا۔ مستقبل کے تصور سے کمود کا دل دہل گیا تھا۔ پہلے بڑے بھیا کی وجہ سے سارا خاندان محفوظ تھا۔ بے فکر تھا۔ بڑے بھیا کا دبدبہ ضرور تھا مگر اس میں ممتا کے جھرنے کل کل کرتے تھے۔ نوکر چاکر، کار اسکوٹر، کھیتی باڑی سب کچھ تھا۔ اس کے کرتا دھرتا تھے بڑے بھیا۔ لیکن قسمت نے ایسی کروٹ لی کہ اس کا پانسہ ہی پلٹ گیا۔ دو سال پہلے اچانک ان کے نابینا ہو جانے کی وجہ سے سارا بوجھ پربھا کر کے کندھوں پر آ گیا۔ پربھا کر کی مضبوط بانہوں میں سارا گھر محفوظ تھا۔ لیکن اس کے بیمار ہوتے ہی سبھی کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ مالک کی غیر موجودگی کا احساس دکان کے نوکروں کو ہونے لگا۔ نوکروں کی منھ زوری بڑھ گئی۔ جس تھالی میں کھایا اس میں وہ سوراخ کرنے لگے۔ آمدنی کم ہو گئی کاروبار رک گیا۔ وعدے ادھورے رہ گئے۔ ایک ایک کر کے کاریں اسکوٹر فروخت کرنے پڑے۔ گھر کی جمع پونجی دھیرے دھیرے ختم ہونے لگی۔ اس پر پربھا کر کے علاج کے لیے پانی کی طرح پیسہ بہہ رہا تھا۔ سبھی کی یہی دعا تھی کہ پربھا کر جلد

www.urduchannel.in

سے جلد ٹھیک ہو جائے۔ اس لیے ہر کسی نے اپنے پاس کی جمع پونجی کمود کے حوالے کر دی تھی۔ بڑی لتاں نے اپنے سارے گہنے، زیور کمود کے سپرد کر دیے۔ ان کی تمنا، امید سر آنکھوں پر رکھ کر کمود نے وہ سارا دھن پربھاکر کے علاج میں لگا دیا۔ کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اتنی کوششوں کے باوجود اس کی طبیعت میں کوئی سدھار نہیں ہوا تھا اور اب ایک ہی حقیقت عیاں تھی کہ پربھاکر کی بیماری لاعلاج ہے۔ موت اس کے سر پر منڈلا رہی ہے۔ یہ آخری اور واضح حقیقت ہے۔ اس کا سامنا کرنے کے لیے کمود کو اب اپنی ساری طاقت داؤ پہ لگانی تھی۔ یہ تو بعد کی بات ہے کہ پربھاکر کے بعد اس گھر کا کیا ہوگا۔ پہلے اس مشکل صورتِ حال کو قبول کرنے کے لیے کمود کو اپنی ساری توانائی جمع کرنا تھی۔

گھر کی چھت کے نیچے نرم نرم بستر پر لیٹنے پر بھی کمود کی نیند اچاٹ ہو گئی تھی۔

''کمود ذرا انھیں چائے تو دے دو۔ تمھاری چائے بھی رکھی ہے۔'' صبح بھابھی نے کہا۔ اس کا گیلا گیلا سا چہرہ بدن پر صرف منگل سوتر کے علاوہ کوئی زیور نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے سہاگ پر مضبوط اعتقاد ہونے کے سبب ہی اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

''آج پربھاکر کا بلڈ ٹرانس پوزن ہے نا؟''

''جی۔ اگر بخار نہیں چڑھا تو ڈاکٹر خون چڑھانا چاہتے ہیں۔''

''چلو، میں بھی چلتا ہوں تمھارے ساتھ۔ میرا بلڈ گروپ بھی ملتا ہے اس سے۔''

''نہیں بڑے بھیا۔'' کمود نے تڑپ کر کہا۔ ''تین مہینوں میں دو بار خون دیا ہے آپ نے۔ اب.....''

''پگلی ہو کیا ہوا! تازہ خون دینا زیادہ اچھا ہے۔ میں چلتا ہوں تمھارے ساتھ۔''

ان کی درخواست کو وہ ٹال نہ سکی۔ وہ کچن میں آئی بھابھی پوجا کی تیاری میں لگی تھیں۔ ''کمود، جلدی سے نہا دھولو۔ اسپتال جانے سے پہلے پوجا ہونی چاہیے۔ آج تمھارے ہاتھوں سے ہوگی۔''

اس نے جھنجھلاتے ہوئے کہا، ''بھابھی کچھ منت مانگی ہو، تو میں نہیں کروں گی پوجا۔ صاف کہہ دیتی ہوں۔ ایسی باتوں پر میرا اعتقاد نہیں ہے۔ منت سے ہونی کو ٹالنا ممکن

www.urduchannel.in

نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو بھیا کی آنکھیں کیسی جاتیں؟"

تیر نکل چکا تھا۔ تب اسے ہوش آیا۔ تبھی کیسی بات نکل گئی منہ سے، اس نے افسوس بھرے لہجے میں کہا، "معاف کرنا بھابھی، غلطی سے منہ سے نکل گیا۔ کیا کروں؟ آج کل دماغ ٹھکانے پر کہاں ہے؟ تبھی کے دل دُکھاتی ہوں نا میں؟"

بھابھی نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی، "ارے پگلی، میں نے برا کہاں مانا۔ کیا میں تمھارے دل کی حالت نہیں جانتی؟ تمہیں نہیں پہچانتی؟ بیاہ کر کے آتے ہی ہم تبھی میں، اس گھر میں ایسے گھل مل گئی ہو جیسے دودھ میں شکر۔ اپنے آپ سے زیادہ دوسروں کا خیال رکھا تم نے یہ برتاؤ بھی ایسا ہی ہے۔ تبھی کے فائدے کے لیے۔ سکھ کے لیے اپنے ذاتی سکھ دکھ کو اہمیت نہیں دینا ہے۔ ہمارے دن تو جیسے تیسے کٹ جائیں گے۔ لتاں کی نظر اس پار لگی ہوئی ہے۔ یہ نابینا ہیں۔ اس پر غریبی میں گیلا آٹا کے مصداق دیور جی نے بستر پکڑ لیا ہے۔ ہماری کشتی ڈوب رہی ہے۔ مگر بچوں کا مستقبل دیکھنا ہے، سنوارنا ہے۔ یہ پوجا مذہبی رسم ہے کمود۔ پہلے بڑی لتاں کرتی تھیں۔ اب ہمیں کرنا ہے اس رسم کو میں نے اپنے خاندان کی بھلائی کے لیے اپنایا ہے۔ اب دھیرے دھیرے یہ ذمہ داری تمہیں سونپنی ہے۔ دیوی ماں سے پرارتھنا کرنی ہے تاکہ پھر سے یہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوں۔"

کمود پوجا کر کے بڑے بھیا کے ساتھ اسپتال آ گئی۔ ان کا خون پربھاکر کو چڑھایا گیا۔ بڑے بھیا، مطمئن ہو گئے۔ "چلو تھوڑا ہی سہی، میں تو کچھ کام آیا۔" پربھاکر کے ایک دوست کے ساتھ کمود نے انھیں بھیجا۔ پربھاکر آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اپنے شوہر کو اس طرح تل تل جھجتے ہوئے دیکھ کر اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے بدن کی کھال کوئی نوچ رہا ہے۔ لیکن وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کم از کم اس کے ساتھ ہی اس کا وجود مٹ جاتا تو وہ آزاد ہو جاتی۔ لیکن یہ بھی اس کے بس کی بات کہاں، بس صرف دیکھتے رہنا ہی اس کے بس میں تھا۔ کمود نے یوں ہی پربھاکر کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اس کم زور لکڑی سے بے جان احساس سے اس کا دل بھر آیا۔ آنکھیں بھر آئیں۔ اسے پربھاکر کے پہلی مرتبہ چھونے کا احساس یاد آ گیا۔ تبھی دروازہ ڈھکیلتی ہوئی بڑی بھابھی

www.urduchannel.in

کمرے میں آ گئیں۔ سارا سامان انھوں نے چھوٹی الماری میں رکھا۔ ''لو چائے لو کمود۔ میں اب گھنٹہ دو گھنٹہ یہیں بیٹھوں گی۔ تب تک تم گھر جا کر آ جاؤ۔ دیکھو گھر جا کر کھانا وانا بنانے کی چکر میں مت پڑنا۔ جو ہے کھا پی کر چلی آنا۔ میں جا کر سنبھال لوں گی۔''

گرما گرم چائے پینے سے اس میں تھوڑی تازگی آ گئی۔ کمرے سے باہر نکلتے ہی اس نے راحت کی سانس لی۔ پربھا کر کی حالت اور فکر نے اسے اس موڑ پر پہنچا دیا تھا جہاں اس کے دل میں گھر کے دوسرے لوگوں کے لیے محبت بڑھ گئی تھی کسی طرح دو تین لقمے نگل کر وہ ضروری چیزوں کے ساتھ اسپتال لوٹی۔

پربھا کر کی حالت خراب تھی۔ سردی سے وہ کانپ رہا تھا۔ سانس اکھڑ رہی تھی۔ بھابھی اور کمود کو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ تبھی پربھا کر کے دوست بھی آ گئے۔ دھیرے دھیرے اس کی کپکپاہٹ کم ہوئی اور تیز بخار چڑھ گیا۔ اس کا بدن جلنے لگا۔ آنکھیں، ناک دہکتے انگارے کی طرح جلنے لگے۔ ڈاکٹر نے آ کر فوراً انجکشن لگایا۔ ڈاکٹر کے ہاؤ بھاؤ سے کمود سمجھ گئی کہ اب وقت آ گیا ہے۔ اس احساس سے اس کا سارا دکھ سینا چیر کر باہر نکلنے کے بے تاب ہو گیا۔ وہ کانپ اٹھی۔ اس کا دل ہوا کہ وہ انھیں باہر جانے کے لیے کہہ کر پربھا کر کے سینے لپٹ کر آخری بار جی بھر کر دل کے سارے پھپھولے پھوڑ ڈالے۔ بچھڑنے کی گھڑی قریب آنے کا احساس ہوتے ہی وہ تڑپ اٹھی۔

ڈاکٹروں کے چکر بڑھنے لگے۔ نرسوں کی بھاگ دوڑ میں تیزی آ گئی۔ ڈاکٹر نے آہستگی سے کمود سے کہا، ''ہم اپنی پوری کوششیں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ پھر بھی بھگوان پر بھروسہ رکھو۔''

سچ تو کہہ رہے تھے ڈاکٹر۔ اچانک کمود کا شعور جاگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پورا خاندان یتیم سا اپنے مسائل کے ساتھ کھڑا تھا۔ نابینا بڑے بھیا، بے بس بھابھی، عمر رسیدہ معذور اماں، گھر پر غربت کا راج، پھٹے پرانے کپڑوں میں بڑے بھیا کی بدقسمت لڑکیاں، اس گھر کی عزت اپنے تن بدن کی لاج، گھر کی لاج بچانے کی ناکام کوششیں، بچوں کی فیس بقایا ہے۔ اماں اور بڑے بھیا کی دوائیاں بند ہو چکی ہیں۔

www.urduchannel.in

گھر کی بھیانک مستقبل کی تصویر اس کے سامنے واضح ہوگئی۔ چاروں طرف مشکلات منھ پھاڑے کھڑی ہیں اور وہ اکیلی یہ سب سنبھالنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے.....اور پربھاکر سے بچھڑنے کا اپنا ذاتی دکھ اس نے دل سے دور کیا۔ اس کا دماغ بڑی ہوشیاری سے منصوبہ بنانے لگا۔ جیسے ایمرجنسی کے دوران ساری قوت سمیٹ کر حفاظت کے لیے ٹھوس قدم اٹھائے جاتے ہیں۔ اس نے دل ہی دل میں یہ بات ٹھان لی۔ جیسا کہ بھابھی نے کہا تھا، ''سبھی کے سکھ کے لیے خاندان کے مفاد کے لیے رسم ورواج کے پالن کے لیے اب وقت آ گیا ہے دکھ کے گیرے سمندر میں ڈوبتے ہوئے اس نے دھیرے سے بھابھی سے پوچھا، ''بابوجی کے پرلوک سدھارنے کے بعد اپنی پڑھائی آدھی ادھوری چھوڑ کر بڑے بھیا نے دکان کا کام سنبھالا ہے نا؟''

ایسا بے سر پیر کا سوال سن کر بھابھی بری طرح چونک پڑی۔ تناؤ سے کہیں اس کا دماغ کا توازن بگڑ تو نہیں گیا ہے؟ انھوں نے پیار سے کہا، ''ہاں، ویسا ہی کرنا پڑا۔ پورے خاندان کا سوال جو تھا۔''

''ان کے نابینا ہونے کے بعد پربھاکر نے باگ دوڑ سنبھالی۔''

''ہاں، دیور جی کے سوائے بھلا اور تھا بھی کون؟'' بھابھی خوش ہوگئی۔

مگر کمود اپنے ہی میں کھوئی ہوئی تھی۔ ''ہر کسی کو اپنی اپنی ذمہ داری سنبھالنی ہوگی۔ ایک دو کا سوال نہیں ہے۔ یہاں اکیلا انسان کیا کرسکتا ہے؟ خاندان کو سنوارنا ہوگا۔ ساتھ ساتھ رہنا ہوگا۔''

''بس کمود، کچھ بات مت کرو آگے۔ نہ جانے کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔ نیچے بیٹھ تو سہی۔ پانی پلاؤں.....''

''نہیں بھابھی بلکہ میرا دماغ اپنے ٹھکانے پر آ گیا ہے۔ میری آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا ہے۔ ابھی اسی وقت کچھ ضروری باتیں کرنا ہوں گی۔ یہی وقت ہے، دیر سے پہنچی تو.....''

اتنے میں ڈاکٹر نے باہر آتے ہوئے کہا ''آپ لوگ اندر جا سکتے ہیں.....''

www.urduchannel.in

سبھی اندر گئے۔ بخار اترنے سے پربھاکر نڈھال ہو گیا تھا۔ اس کا پورا بدن پسینے سے تر بتر تھا۔ کمود نے پسینہ پونچھا۔ اس کے پاس بیٹھ کر وہ اس پہ جھک گئی۔ اپنا منھ اس کے کان کے پاس لے جا کر اس نے آہستگی سے کہا، ''اب اچھا لگ رہا ہے نا تمہیں؟ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

پربھاکر نے بڑی مشکل سے ہامی بھری۔ کمود نے کہا، ''ایک گزارش ہے تم سے..... میرے لیے..... ہم سبھی کے لیے..... تم، تم اپنی آنکھیں بڑے بھیا کو دے دو..... سن رہے ہو نا؟ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

بڑی بھابھی دوڑ کر اس کے پاس آئیں۔ ہونٹ بھینچ کر وہ اسے پربھاکر سے دور کھینچنے کی کوشش کرنے لگی..... اڈاڈ کر دل پھاڑ کر باہر نکلنے کے لیے بیچین لاوا اپنی سسکیوں کے ساتھ کمود نے اپنے سینے ہی میں دبا لیا اور پختہ لہجے میں کہا ''نہیں بھابھی، ان کے جانے سے پہلے ان کی رضامندی لینا ضروری ہے۔ سنا تم نے؟ یہ بات منھ سے نکالنے کے لیے مجھے کتنا درد ہو رہا ہے۔ کتنی تکلیف..... سمجھ رہ ہو نا..... تمھارے پیچھے ہم سب کیسے زندہ رہیں گے؟'' اس سے آگے بولا نہیں گیا۔ پربھاکر نے آنکھیں کھولیں۔ اس کے چہرے پر پل بھر کے لیے اعتماد تیر گیا۔ اس نے ہمدردی سے اس کے جانب دیکھا۔ پھر لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا ''ہاں..... میں کرتا ہوں..... ڈاکٹر..... کارڈ..... میں دستخط کروں گا۔'' اتنا کہہ وہ ہانپنے لگا۔ تھک ہار کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ کٹے ہوئے پیڑ کی طرح کمود اب گری، تب گری..... مجھے بھروسہ تھا..... تم..... تم میری بات مان لوگے۔'' وہ زاروقطار رونے لگی۔ درد کے طوفان میں بہہ کر اس نے پربھاکر کی بے جان چھاتی پر اپنا سر جھکا دیا۔ پربھاکر نے اپنا تھرتھراتا ہاتھ اٹھا کر پیار سے اس کے بال سہلائے۔ اس کے بے جان ہوئے لمس سے کمود کا رہا سہا توازن بھی کھو گیا۔ کمرے میں باقی لوگ بت بنے کھڑے رہے۔ موت کے گہرے اندھیرے میں پل بھر کے لیے سبھی کو یہ احساس ہوا کہ چاروں اور ایک عجیب سی روشنی جگمگا رہی ہے۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

پارٹی

م- ل- ورہانڈے

جتنے خلوص سے میں نے دلیپ کو دعوت نامہ دیا اتنی ہی بے مروّتی سے اس نے اسے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا مجھے پاگل کتّے نے کاٹا ہے؟" غرّاتے ہوئے اس نے کہا۔ اس کا یہ برتاؤ دیکھ کر میں بھی بے شک کہنے والا تھا کہ میں نے دانتوں تلے زبان دبالی۔ غلطی سے اسے پاگل کتّے نے اگر کاٹا ہو تو ہوسکتا ہے وہ مجھے بھی کاٹ لے۔ پیٹ میں دیئے جانے والے چودہ انجکشن کا رسک کون لے؟ کبھی کبھی تو یہ انجکشن بھی ہسپتالوں میں موجود نہیں ہوتے۔

"دیکھو دلیپ" میں نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "میں تو تمہیں پارٹی کا دعوت نامہ دے رہا تھا۔" "مگر میرے پاس وقت نہیں۔ اس وقت مجھے

www.urduchannel.in

ایک ماتمی جلسے میں جانا ہے۔'' جھڑکتے ہوئے اس نے کہا۔

''اب اس پارٹی کو بھی ماتمی جلسہ ہی سمجھ لو۔ چاہو تو مگر تمہیں ضرور آنا ہے،'' میں نے اصرار کیا۔ ''دیکھو یہ ہمارے پبلی کیشنز کی کتاب ہے اور بذاتِ خود مصنفہ متھو سوامی فرسٹ کلاس پارٹی دینے والی ہیں۔ وہ کاویری متھو سوامی بوگس ہے اور نولپور کے بھی بوگس لوگ وہاں جمع ہوں گے۔ اس نے کہا۔ ''دیکھو دلیپ، لوگوں پر آتے جاتے ایسی تنقید کرنا اچھی بات نہیں۔''

''مجھے عقل مت سکھاؤ۔ جب سے تم نے یہ کتابیں شائع کرنے کا کاروبار شروع کیا ہے تب سے تم بھی بے ایمان ہو گئے ہو۔''

''وہ کیسے بھائی؟'' میں نے معصومیت سے پوچھا۔

''کتنے پیسے لیے تم نے متھو سوامی سے یہ کتاب چھاپنے کے لیے؟'' کسی مخبر کی طرح اس نے یہ سوال کیا۔ ''دیکھو دلیپ' ایسے الزامات مجھ پر مت لگاؤ۔ اسے پبلشر لون کہتے ہیں۔ پبلشر کو دیا ہوا قرض!'' میں نے اپنی گھبراہٹ چھپاتے ہوئے کہا۔

''یس' نان ریفنڈ ایبل لون! بغیر واپسی کا قرض۔'' ''بزنس کی باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ یہ مصنف اور پبلی شر کا معاملہ ہے۔''

''بس' بس' اپنی بے ایمانی کا فلسفہ مت بگھارو۔ اچھا چھوڑو، کیا نام بتایا کتاب کا؟''

''ایک دم فرسٹ کلاس فینس کتاب ہے۔'' میں نے جوش میں کہا۔ ''کاویری متھو سوامی کی آزادیٔ نسواں کا نچوڑ ہے اس میں۔ نیویارک کی میڈم اسٹون ہیڈ کا تعارف بھی شامل ہے اور.....''

''یہ سب کس نے پوچھا؟ میں پوچھ رہا تھا کیا نام ہے کتاب ہے؟'' اس نے بوریت سے پوچھا۔ میں نے سینہ پھلا کر کہا۔ ''اینڈ گاڈ کریٹیڈ وومن''۔ ''اینڈ رپینٹنگ سنس دین'' دلیپ نے منہ بنا کر کہا! ''تب سے پچھتا رہا ہے بے چارہ۔

اب مجھے بھی غصہ آنے لگا۔ ''جب سے تمہاری محبت ناکام ہوئی ہے تب سے تم

www.urduchannel.in

خواتین مخالف ہو گئے ہو۔"

"میں مرد اور عورت میں بھید بھاؤ نہیں کرتا۔ منھو سوامی کا یہ کتاب لکھنا بے وقوفی ہے اور اسے شائع کرنا تمہاری سب سے بڑی حماقت ہے۔ اس طرح کی حماقتیں کرنے کے بعد پارٹی دینا تو بے وقوفی کا قطب مینار ہے۔"

"او۔ کے دلیپ' میں مانتا ہوں کہ اس دنیا میں کوئی عالم ہے تو وہ صرف تم ہی ہو' مگر تم پارٹی میں ضرور آنا۔" میں نے اسے مسکہ لگاتے ہوئے کہا۔ "نو لپور ٹائمز" میں نیوز شائع کرنی ہے۔ اس لیے کہہ رہا ہوں۔"

ٹھیک ہے! دلیپ نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ٹھیک ہے' تم اتنا اصرار کر رہے ہو تو آجاؤں گا۔ دوست کے لیے تو بھگوان کرشن نے بھی رتھ چلایا تھا۔" اس نے ایک ڈائری نکالی۔ "دیکھ بھائی اس دن مجھے دو پروگرام کور کرنے ہیں۔ ایک ماتمی جلسہ اور دوسرا آہا ایکزیبیشن کا افتتاح۔ پہلے پروگرام کے لیے میں کسی اور کو بھیج دوں گا۔ مگر آہا کے افتتاح میں میرا جانا ضروری ہے۔ ہاں وہ پروگرام ختم ہوتے ہی آجاؤں گا۔"

"دلیپ' یہ آہا کیا بلا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہوگی کچھ بھی مگر کتاب کی رسم رونمائی جیسی کوئی بے مطلب پارٹی نہیں ہے۔"

"اب تو سیدھا جواب دے گا بھی یا نہیں!" میں نے چڑ کر کہا۔

"دوست' دنیا میں کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جنھیں کیا کھانا چاہئے اور کیا نہیں، اس کی فکر لگی رہتی ہے۔ غلط چیزیں کھا کھا آدمی اپنی صحت بگاڑ لیتا ہے۔ تجھے لائنس معلوم ہے نا! ویسے ہی اس گروہ کے لوگ بھی خود کو "آہاری" کہتے ہیں۔ اب ہمارے "نو لپور ٹائمز" کے منیجر بھی "آہاری" ہیں اس لیے چیف رپورٹر کی حیثیت سے مجھے وہاں جانا ضروری ہے۔ وہ پروگرام کور کر کے میں آتا ہوں۔"

اس دورے کے بعد میرا جی کچھ ہلکا ہو گیا۔ پارٹی دینے کی ذمہ داری میری' مگر اخبار میں رپورٹ شائع کرنے کی ذمہ داری تمہاری' ایسا کاویری جی نے کہا تھا۔

میں پبلی شر تھا۔ کاویری مصنفہ تھیں۔ پیسے والی تھیں۔ وہ ایسی ویسی مصنفہ نہیں

www.urduchannel.in

تھیں۔ نولپور کی سماجی اور سیاسی قدروں اور مسائل پر ریسرچ کرنے کے لیے امریکہ کی مشہور فیدفاؤنڈیشن کی اور سے انھیں اسکالرشپ ملی تھی۔

پارٹی میں دلیپ آیا۔ اس وقت پارٹی اپنے شباب پر تھی۔ اس وقت سبھی لوگ کھانے پر ٹوٹ رہے تھے اس کے چہرے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بات سے بہت متاثر ہو۔ کہنے لگا۔ ''دوست ''آہار'' پروگرام میں جو تقریریں میں نے سنیں اس سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ ہم جو کچھ کھاتے ہیں، پتہ ہے اس میں نوے فی صد چیزیں صرف زہر ہوتی ہیں، زہر! اور جو کچھ ہم پیتے ہیں وہ صرف زہرِ ہلاہل!''

مجھے آثار اچھے نہیں لگے۔ مجھے محسوس ہوا دلیپ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور کرے گا۔

''اب اس پانی ہی کو دیکھو'' ٹیبل سے پانی کا گلاس اٹھا کر ڈرامائی انداز سے دلیپ نے کہا۔

''کیا ہوا اسے؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''کینسر!' ''کیا؟''

''یس' کینسر، دلیپ اب اونچی آواز میں بولنے لگا تھا۔ اب تم ہی دیکھو، کتنا اینوسینٹ دکھائی دے رہا ہے یہ پانی۔ کتنا صاف، شفاف، دو چار لوگ گلاس، ہاتھ اونچا اٹھا کر بولتے دلیپ کی جانب حیرت سے دیکھنے لگے۔ یہ دیکھ کر اس کے جوش میں اضافہ ہوا اور وہ کہنے لگا ٹورنٹ کے کن پاپ انسٹی ٹیوٹ میں جب ڈاکٹر فش وائر نے اس شفاف پانی پر تحقیق کی تو کیا ملا ہوگا انھیں اس میں؟

''کیا؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''پینیشن؟'' ''کیا کہا؟''

بس، پینیشن، دلیپ نے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا۔ جو لوگ سالہا سال سے پانی پیتے ہیں۔ ان کے پیکر پر پینشن کا اثر پڑتا ہے۔ پتھر پر ہر لمحہ ٹپکنے والے پانی کے قطرے جب .....ٹپ ٹپ.....''

''پھر؟'' کسی نے پوچھا۔

www.urduchannel.in

''پھر کیا؟'' منھ بناتے ہوئے دلیپ نے کہا۔ ''سیدھے کینسر''
''او ماں.........'' کوئی لڑکی چلائی۔
''نیو یارک کے جارج واشنگٹن ہسپتال میں کینسر کے مریضوں کا معائنہ کیا گیا۔ پتہ ہے آپ کو کیا پتہ چلا؟
''کیا؟'' سب لوگوں نے ایک آواز میں کہا۔
''پانی؟ ہاں پانی، سارے مریضوں کے پینے کا پانی۔''
اس کا مطلب یہ ہوا کہ پینے کے پانی کے سبب ہی ہوا۔ یہی نا کسی نے کہا۔
''یو آر این انٹیلیجنٹ ہرس'' دلیپ نے پیار سے اس شخص کی پیٹھ تھپتھپائی۔
'' آج سویرے سے گلا سوکھ رہا تھا۔ بار بار۔ ذرا زیادہ ہی پانی پی لیا میں نے آج، کچھ ایسا ویسا تو نہیں ہوگا نا؟'' کسی خاتون کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔
'' کیوں نہیں ہوگا؟'' اس سے پہلے کہ دلیپ جملہ پورا کرتا۔ کسی عورت نے چلایا ''مرگئی ماں!'' اور کچھ ہی پل میں وہ عورت چکر کھا کر نیچے گر پڑی۔
مائی گاڈ! یہ تو سورنا دیوی ہیں، ہماری ایم۔ پی، چاروں طرف افراتفری مچ گئی۔
چار پانچ ڈاکٹرس دوڑے۔ کسی نے ایمبولینس کو فون کیا۔ چار پانچ منٹ میں ہی ہسپتال سے گاڑی آگئی۔ اور سورنا دیوی ایم۔ پی کو لے گئی۔
نولپور کے میئر نے دلیپ کے کانوں میں پھسپھساتے ہوئے کہا، ''دیکھا تم نے؟ تم نامہ نگار لوگ نل کے پانی کے لیے چلاتے ہو۔ لوگوں کی صحت ٹھیک رہے اس لیے تو ہم یہ سب کرتے رہتے ہیں۔ یعنی ٹو چیک آل واٹر بورن ڈیسیز یز۔ دیکھا نا پانی کا نتیجہ۔ نو واٹر، نو ڈیسیز یز، ایک یا دو بس۔ کل ہی سلوگن بنانے کا آرڈر دیتا ہوں ہمارے پبلی سٹی ڈپارٹمنٹ کو.........''
''واہ میئر صاحب!'' دلیپ نے ان کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے آپ کو بھارت رتن یا کم از کم، پدم شری تو ضرور ملنا چاہئے۔
اس خبر سے کہ پارٹی میں دیا جانے والا پانی زہر آلود ہے اور اس سے ایم۔ پی بے

www.urduchannel.in

ہوش ہوگئی ہیں۔ لوگ ڈر گئے۔ جنھوں نے بوند بھر بھی پانی پیا تھا۔ ان کے پیٹ میں ہاہا کا درد اٹھنے لگا۔ جنھوں نے نہیں پیا وہ اپنے آپ کو تقدیر والا سمجھنے لگے۔ جن میزوں پر پانی کے گلاس رکھے تھے وہاں سے بھیڑ غائب ہوگئی۔

''یہ بھی کوئی بات ہوئی؟''

کاویری منتھوسوامی پارٹی کے مہمان خصوصی وزیر صحت ساکھرے جی کو مطمئن کرتے ہوئے بولیں۔ ''میں نے تو پانی میں خوشبو کے لیے اس میں عطر کے دو چار قطرے ڈالوا دیئے تھے۔ ہوسکتا ہے اس سے ری ایکشن ہوگیا ہو مگر اس میں اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے؟ ابھی میں سارا پانی تبدیل کروا دیتی ہوں۔

''ارے یہ کیا! آپ کے ہاتھ خالی ہیں؟'' یہ گاجر کا حلوہ لیجئے نا۔'' منتھوسوامی نے وزیر صحت کے ہاتھ میں ایک حلوے کی ڈش تھما دی اور وہاں سے پانی تبدیل کرنے کے لیے چلی گئیں۔ وہ گئیں اور وہاں دلیپ آدھمکا۔

''واہ ساکھرے جی۔ کھائیے جائیے گاجر کا حلوہ کل کچھ ہوا تو مت بولنا۔ دلیپ نے آگاہ نہیں کیا تھا.........'' ساکھرے جی نے گھبرا کر ایک بار دلیپ کی اور اور ایک بار گاجر کے حلوے کی جانب دیکھا۔ آیئے نامہ نگار صاحب!

ہلکی سی ہنسی کے ساتھ انھوں نے دلیپ کا خیر مقدم کیا۔ ''کیا خبر ہے؟''

''خبر تو بری چیز ہے۔ منتری جی۔'' دلیپ نے روتی صورت بنا کر کہا۔ لندن کے کوئنس ہاسپٹل میں سرجری کے ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ ڈاکٹر منکی ہیڈ کا ایک لاڈلا بندر تھا۔

''تھا؟'' منتری جی نے گھبرا کر کہا۔

''ہاں، اب تو اسے تھا ہی کہنا پڑے گا۔ اب تو ایسے میں اس کی ایک بڑی قبر بن گئی ہے۔ کہتے ہیں! اس قبر کی بناوٹ ''ٹیومر'' جیسی ہے۔'' منتری جی کو گھیرے ہوئے تولپور کے کچی شکر کارخانوں کے مالک یہ سمجھ کر کہ دلیپ نے کوئی مزے دار بات کہی ہے، وہ زور سے ہنس پڑے۔ منتری جی نے انھیں جس نظر سے دیکھا اس میں مٹھاس نہیں تھی۔

''تو منتری جی'' دلیپ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''ڈاکٹر منکی ہیڈ اس

www.urduchannel.in

بندر کو روز گاجر کھانے دیتے تھے۔ کچھ ہی دنوں بعد اس کا پیٹ بڑھنے لگا۔"

"اور شکر؟" کسی نے پوچھا۔

"بتاتا ہوں" اپنا چہرہ سنجیدہ بناتے ہوئے دلیپ نے کہا۔ "شکر تو سفید زہر ہے۔ گاجر اور شکر از ڈیڈلی کامبینیشن۔"

"اب میں کیا کروں!" ڈر کے مارے تھر تھر کانپتے ہوئے منتری جی نے کہا۔

دیش میں گاجر کی کاشت پر پابندی لگا دیجئے اور ہو سکے تو شکر کے سارے کارخانے بند کروا دیجئے۔ نہ رہے گی گاجر شکر، نہ رہے گا حلوہ" دلیپ نے مشورہ دیا۔

"اسمبلی کے اگلے اجلاس میں ہی بل پیش کروں گا۔ مگر میں نے ابھی جو حلوہ کھایا ہے۔"

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں منتری جی! حلوہ کھانے کے آدھے گھنٹے کے اندر اسٹمک واش لے لیں تو شاید دلیپ کا جملہ پورا ہونے سے قبل ہی بجلی کی رفتار سے منتری جی دروازے کی جانب لپکے ان کے پیچھے ان کے پی۔اے، کلکٹر، فوجدار اور شکر کارخانوں کے مالکان بھی بھاگے۔

اتنے میں کاویری متھو سوامی آئیں۔ حلوہ بہت اچھا بن گیا ہے۔ کاویری جی! چمچہ منہ میں ڈالتے ہوئے دلیپ نے کہا۔

تھینک یو۔ دلیپ جی، مگر منتری جی کہاں.....وہ گئے اسٹمک واش لینے۔ دلیپ نے خبر دی۔

"مائی گاڈ!" متھو سوامی نے بھگوان کی اور دیکھ کر ہاتھ جوڑے اور پورچ کی طرف دوڑ لگائی۔ اتنے میں نولپور کے مشہور ڈرامہ نگار پروفیسر مہیش منڈلکر نے دلیپ کو پکڑا۔ ان کا چہرہ سیاہ ہو گیا تھا۔ کیا خبر ہے بنڈلکر؟ کوئی دہشت سے بھرا یا عریاں ڈرامہ لکھا گیا ہے؟ پانی کا گلاس منہ کو لگاتے ہوئے دلیپ نے پوچھا۔

"وہ لکھنے کے لیے میں زندہ رہوں تب نا!"

بنڈلکر تمہارے ہوتے ہوئے! بولے۔

www.urduchannel.in

''ارے ایسا کیا ہوا بنڈلکر!'' دلیپ نے حیرت سے پوچھا۔

''اس پارٹی کا پانی میں نے بھی پیا ہے مگر اس کا کوئی علاج ....؟ بنڈلکر کی آنکھیں ابھر آئیں۔ ''تمہاری جیب میں الکوہل رہتی ہے نا؟ پانی میں تھوڑی انڈیلو اور ملا کر پیٹ میں انڈیل لو۔ یہی اس کا علاج ہے۔''

بنڈلکر جیب ٹٹولتے ہوئے باتھ روم کی طرف بھاگے۔

دلیپ! میں نے اسے چپ رہنے کے لیے کہا۔ دُم میں لگی آگ لے کر مزے سے لنکا میں گھومنے والے بندر کی مجھے یاد آگئی۔

ٹھہر جا یار! میرا ہاتھ دور کرتے ہوئے اسنے کہا۔ وہ دیکھ ہمارے نولپور کی شاعرہ اروشی مجھے اشارہ کر رہی ہے۔ چل، ذرا اس سے ملتے ہیں۔'' اتنا کہہ کر وہ اروشی کی جانب لپکا۔

''ہائے دلیپ! دلیپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اروشی اپنے اسٹائل میں بولی۔ ''تم نے میرا نیا مجموعہ پڑھا یا نہیں؟ آئی مین ------''

''وہائے ناٹ! ناک'' ----------------دلیپ یہ اچھا نہیں ہے، تم ہمیشہ مجھے نظر انداز کرتے ہو۔ اروشی نے بناوٹی غصہ دکھایا۔

کیا کروں اروشی تمہاری نظمیں پڑھ کر کچھ ایک -----۔ تو ہوتا ہی ہے۔ سوچا.......دلیپ نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

اس بار تمہیں ایک پورا صفحہ تبصرہ لکھنا ہے۔ یو ناٹی بوائے! دلیپ کو ہلکی چپت لگا کر اس نے کہا، جب تم نے اتنے پیار سے میرا ہاتھ پکڑا تبھی میں جان گیا تھا، مگر یہ تم کیا کھا رہی ہو؟

سہمے ہوئے لہجے میں دلیپ نے پوچھا۔

''چیز پکوڑا۔ مگر تم اتنا ڈر کیوں رہے ہو؟'' ''اروشی، نیوجرسی میں رہنے والے ایک ملٹی میلینئر فارم............کو چیز کھانے کا شوق تھا۔ کچھ ہی دنوں میں ان کے چہرے میں تبدیلی ہونے لگی۔

www.urduchannel.in

.....اروشی ڈر کر دلیپ کی جانب دیکھنے لگی۔ کینڈی سینٹر میں اس پر ریسرچ کیا گیا وہاں چوہوں کو چھ ماہ تک چیز کھلایا گیا۔ ایسا دیکھا گیا کہ جس چوہے نے، جس جانور کے دودھ سے بنا چیز کھایا اس کا چہرہ اسی جانور جیسا ہونے لگا۔

''مائی گاڈ! اروشی چلائی۔''

''اور اروشی، دلیپ نے سنجیدگی سے کہا، کہتے ہیں نولپور جو چیز بنتا ہے وہ اونٹ کے دودھ کا بنا ہوتا ہے۔''

ای.....اروشی ہاتھ میں لی ہوئی پلیٹ پھینک کر چلائی اور منہ چھپا کر وہاں سے بھاگ گئی۔ دلیپ بہت ہو گیا یہ سب.....میں نے ہاتھ جوڑ کر اس سے کہا۔

''واہ! تو کیا میں جو بول رہا ہوں وہ سب تمہیں جھوٹ لگ رہا ہے؟ اس سے پہلے کہ اس سے کچھ کہوں اس نے مجھ سے پوچھا۔ ہندی فلموں میں جو پنجابی ہیروئن ہوتی ہیں وہ ساری گول چہرے والی کیوں ہوتی ہیں؟

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ چنے کھاتی ہیں! اور وہ سب مدراسی امائیں پھولے ہوئے گالوں کی کیوں ہوتی ہیں؟

''کیوں کہ وہ اڈلی چباتی ہیں۔ ناگپور کے لیڈی ڈرون کالج کے ہوم سائنس ڈپارٹمنٹ میں جو تحقیق ہوئی

دلیپ.....زیادہ پھینک مت!'' میں نے غصے سے کہا۔ ''ٹھیک ہے دوسرے ٹیبل کی اور جاتے ہوئے اس نے کہا۔ وہاں دہی بڑے کھا رہے لوگوں کو سمجھانے لگا کہ دہی بڑے سے برین ٹیومر کیسے ہوتا ہے۔ جلیبی کھانے والوں کو اس نے بتایا کہ جلیبی سے دل کیسے کمزور ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کو اس نے یہ بھی بتایا کہ آئس کریم کھانے کے بعد فرانس کے کچھ لوگوں کو کس طرح ایڈز ہوا۔ میں نیا کیا کہہ رہا ہوں۔

معصومیت سے دلیپ نے کہا۔ یہ سب روز اخبارات میں شائع ہوتا رہتا ہے اور ماہرین تغذیہ کا جو سیمینار آج میں نے کور کیا اس سے تو میرے علم میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔

www.urduchannel.in

پارٹی ختم ہونے لگی۔ کھانے کی ٹیبل پر جانے کی کسی میں ہمت نہیں تھی اِدھر دلیپ کی تقریر زور وشور سے جاری تھی۔ یہ کھایا تو.....وہ پیا تو.....میں تھک کر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں پورچ میں کچھ گڑبڑ ہوئی۔ سارے لوگ ادھر دوڑنے لگے میں نے ایک شناسا سے پوچھا کہ کیا ہوا؟

ارے تمہیں معلوم نہیں! 'کاویری' منتری جی کو ہسپتال میں چھوڑ کر گاڑی سے پورچ میں اتری ہی تھیں وہاں مہیش بنڈلکر جی نے ان کے گالوں کی چٹکی لی''

''کیا!''میں چیخ اٹھا۔

کہتے ہیں وہ نشے میں دھت ہیں۔لوگوں نے انھیں ڈانٹا تو کہنے لگے وہ ایسا ویسا کچھ پیئے ہوئے نہیں تھے۔انھوں نے صرف پنیسلن کا ایسڈ لیا تھا۔ غصّے میں آکر میں دلیپ کو ڈھونڈنے لگا۔آخر وہ مجھے ایک کونے میں دکھائی دیا۔ایک بڑی سی ڈش میں گاجر کا حلوہ۔ چیز، پکوڑے، دہی بڑے، جلیبیاں، رس گلّے۔سبھی کچھ مزے لے لے کر کھا رہا تھا۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

آہٹ

ماروتی چتم پلی

کبھی کبھی میرے ساتھ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ساری باتیں میرے ذہن و دل پر نقش ہوتے ہوئے بھی کاغذ پر بکھر نہیں پاتیں۔ کاغذ سے قلم چھوتے ہی جس انسان کے بارے میں لکھنا چاہتا ہوں وہ پرندے کی طرح اپنے پنکھ پھیلا کر اڑ جاتا ہے، ایسے وقت میں مجھے نصف شب گزرنے کے بعد نیند نہیں آتی۔ میں ٹیبل لیمپ جلاتا ہوں۔ ٹیبل پر سفید کورے کاغذ موجود رہتے ہیں اور ہاتھ میں قلم۔ کھڑکی سے آسمان کے تارے جھانکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

گیٹ کے پاس میرے گھر کی جانب آنے والے راستے پر ریت بچھائی ہوئی ہے۔ گیٹ کی آواز نہ آتے ہوئے بھی، راستے پر چلتے ہوئے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔ آدھی رات

www.urduchannel.in

گزر جانے کے بعد کون آ رہا ہے؟ تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ میں برآمدے میں کھڑے ہو کر دیکھتا ہوں تو ایک شخص نظر آتا ہے۔

کمر تھوڑی سی جھکی ہوئی، کالی اور آسمانی رنگوں کی دھاری دار لنگی اور گھٹنوں تک لمبا کرتا پہنے ہوئے، کندھے پر بڑا سا رومال رکھا ہوا ہے۔ بالوں میں سفیدی جھانک رہی ہے۔ سہارا دینے کے لیے ایک ہاتھ میں چھڑی ہے۔

میں دروازہ کھولتا ہوں۔ بلب کی روشنی میں اس شخص کا جائزہ لیتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس شخص کو کئی سال پیشتر دیکھ چکا ہوں۔ لیکن کب اور کہاں ملاقات ہوئی ہے یہ یاد نہیں آتا۔

وہ مجھ سے پوچھتا ہے۔ یہاں پر ماروتی صاحب رہتے ہیں؟ وہ گھر پر ہیں کیا؟

میں نے کہا، ''ہاں۔ میں ہی ہوں۔'']

''مجھے تم نے پہچانا نہیں میں شولاپور کے پاشا پیٹھ سے آیا ہوں۔ جب تم چھوٹے تھے تب افلاطون لینے میری دکان پر آتے تھے۔

''ہاں اب یاد آیا۔ تم تم رستم جی چاچا ہو نا؟''

''ہاں۔ چلو اچھا ہوا مجھے پہچان لیے۔''

''چاچا آپ کو بھول جانا ممکن ہی نہیں۔''

''میں نے سنا ہے کہ تم بہت بڑے لیکھک بن گئے ہو۔ میں اپنی کیفیت لے کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ تم میری کہانی لکھو۔''

میں نے چاچا کو اندر آنے کے لیے کہا۔ وہ شطرنجی پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ ہاتھ کی لکڑی دائیں طرف رکھ دی۔ وہ میری جانب دیکھ رہے تھے۔ روشنی میں ان کے چہرے کی سلوٹیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک ایک سلوٹ میں کتنے ہی غم پوشیدہ تھے۔ چاچا کی جانب ایک ٹک دیکھتے ہوئے مجھے میرا بچپن یاد آ گیا۔ میری عمر دس بارہ سال کی ہوگی۔ تب سے میں انھیں دیکھ رہا ہوں۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے میں نے شولاپور کو خیر باد کہہ دیا۔ اس کے بعد میری ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔ پاچھا (پاشا) پیٹھ کے ایک پرانے باڑے میں رہتے تھے۔ اس علاقے کو پاشا پیٹھ کہتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ساری بستی مسلمانوں کی تھی۔ ہمارے باڑے کے

www.urduchannel.in

سامنے نعل بند نام کا خاندان رہتا تھا۔ اس کے سامنے ایک بوڑھا مسلمان اپنی جوان بیٹی کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے گھر کے قریب ہی ایک گلی تھی۔ اس گلی میں ایک اور مسلمان فیملی رہتی تھی۔ اس کے گھر کا ایک دروازہ بڑی سڑک کی جانب اور دوسرا دروازہ گلی کی جانب کھلتا تھا۔ اس کے درمیان پانچ، چھ سو مربع فٹ کھلی جگہ تھی۔ مگر چاروں طرف گھر کی دیواریں کھڑی تھیں۔ اس میں داخل ہونے پر دائیں جانب کی دیوار سرودے ماسٹر کے گھر کی تھی۔ بائیں طرف ایک پرانا باڑہ تھا۔ اس میں ایک ہندو پریوار رہتا تھا۔ اسی باڑے سے سٹا ہوا رستم جی چاچا کا گھر تھا، رات میں اور صبح سویرے یہاں اندھیرے کا راج رہتا تھا۔

اس گھر کے پیچھے کی جانب بھینسوں کے لیے طویلہ تھا اور سامنے بڑا سا دالان۔ دالان کے ایک کونے میں سوت کاتنے کا ساچہ (کرگھا) تھا۔ وہیں پر رستم جی چاچا ہاتھ کرگھے پر کپڑا بنتے ہوئے دکھائی دیتے۔ ڈھوٹا ادھر سے ادھر جاتے ہوئے سٹک سٹک کی آواز آتی تھی۔

وہاں پر ایک بڑا سا دروازہ تھا۔ اس دروازے سے رستم جی چاچا کی بھینس آتے جاتے دکھائی دیتی تھی۔ دوسرے گوالوں کی طرح ان کی چار پانچ بھینسیں جنگل میں گھاس چرنے کے لیے کبھی جاتے ہوئے دکھائی نہیں دیں۔ بڑے دروازے سے کچھ ہی فاصلے پر ان کی چھوٹی سی کرانے کی دکان تھی۔ دکان کے سامنے ہی سے بی ڈویژن پولس اسٹیشن کی عمارت شروع ہوتی تھی۔ وہیں پر پولس والوں کے لیے لمبی سی چال اور پولس افسران کے لیے بنگلے بنے ہوئے تھے۔ اس عمارت کے آخر میں ایک اونچی سی دیوار تھی۔ دیوار کے پیچھے جیل تھی۔ اس میں کرتا اور گھٹنے تک چڈی پہنے ہوئے قیدی باغبانی کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

رستم جی چاچا کے گھر کے سامنے میونسپلٹی کا ایک نل تھا۔ مگر اس پر چاچا کی ہی حکومت تھی۔ اس نل پر عورتوں کی بھیڑ ہونے کے باوجود آپس میں جھگڑا نہیں ہوتا تھا۔ چاچا سے سبھی ڈرتے تھے۔ سبھی عورتوں کو چاچا نے حکم دے رکھا تھا کہ وہ صبح سویرے منھ اندھیرے نل پر اکیلے نہ آئیں۔ کیوں کہ سامنے ہی جیل اور پولس اسٹیشن ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے اس حکم کی کسی بھی آدمی نے مخالفت نہیں کی۔

چاچا کسرتی بدن کے مالک تھے۔ روزانہ ڈنڈ، بیٹھک لگا کر ان کا جسم فولادی بن

www.urduchannel.in

گیا تھا۔ ایسا فولادی انسان بڑھاپے کے آگے جھک جائے گا۔ میں نے سوچا بھی نہ تھا۔

دکان میں ایک چٹائی پر وہ بیٹھے رہتے تھے۔ ریک پر مختلف قسم کے بسکٹ پاؤ بٹر وغیرہ رکھا رہتا۔ کانچ کی برنیوں میں سے نان خطائی، افلاطون دکھائی دیتے۔ آلو بخارا، اخروٹ، بادام، چاکلیٹ اور شکر کی رنگ برنگی گولیاں موجود رہتیں۔ بڑوں سے زیادہ بچوں کی دلچسپی کا سامان دستیاب ہونے کے لیے دکان مشہور تھی۔

مجھے جیسے ہی جیب خرچ کے لیے پیسے ملتے میں دکان پر پہنچ جاتا۔ دوپہر کے وقت چاچا چٹائی پر بیٹھے اونگھتے ہوئے دکھائی دیتے۔ سارے محلے والے چھوٹے بڑے انھیں چاچا ہی کہہ کر پکارتے تھے۔ میں بھی چاچا کہتا تھا۔

"رستم چاچا، مجھے ایک افلاطون دیجئے۔"

"کون ہے رے۔ ایسے بے وقت آنے والا۔ یہ کیا دکان میں آنے کا وقت ہے؟" ان کی نیند ٹوٹ جاتی تھی۔

"دیجئے نا ایک افلاطون۔" میں دوبارہ کہتا۔

"کون ہے بے؟ کیا چاہئے؟" وہ غراتے۔ "چل بھاگ یہاں سے بڑا آیا افلاطون کھانے والا۔"

یہ تجربہ مجھے ہی نہیں بلکہ محلے کے تمام بچوں کو ہو چکا تھا۔ ان کی دکان کھلی رہنے کا وقت شام کا تھا۔ صبح وہ ہاتھ کرگھے پر کام کرتے اور دکان ان کے آرام کی جگہ تھی۔ محلے کی ساری عورتیں چاچا کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھیں۔ اسی لیے وہ ان کی دکان پر بے وقت کبھی نہ جاتیں۔ دکانداری کس طرح نہ کی جائے، چاچا اس کی مثال تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ انھیں دکان کی ضرورت ہی نہ تھی۔ بھینسوں کا دودھ بیچ کر ہی گزر بسر ہو جاتی تھی۔

ان کے گھر میں ان کی بیوی، ایک لڑکا سید اور فاطمہ نام کی ایک لڑکی تھی۔ ان کا لڑکا بھی گٹھیلے بدن کا مالک تھا۔ جسمانی تعلیم بھی خوب کرتا تھا۔ ہم بھی اسے سید پہلوان ہی کہتے تھے۔ سارے محلے میں اس کا دبدبہ تھا۔

گھر میں پردے کا اہتمام تھا۔ ہم نے چاچی کو اس وقت دیکھا جب ان کی عمر ڈھل

www.urduchannel.in

گئی تھی۔ مگر فاطمہ کو ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ ہمیشہ پردے کے پیچھے رہتی۔ ہم نے اسے باہر آتے جاتے کبھی نہیں دیکھا۔ سیّد پہلوان کے رشتے آنے لگے۔ مگر پہلے فاطمہ کی شادی کرنے کے لیے چاچا نے لاکھ جتن کیے پھر بھی نتیجہ صفر ہی رہا۔ چاچا اپنی اکلوتی بیٹی سے بے حد پیار کرتے تھے۔ جس طریقے سے انھوں نے بچوں کی پرورش کی تھی وہ فاطمہ کے لیے اسی طرح کا گھر تلاش کر رہے تھے۔

فاطمہ کو دیکھنے کے لیے لڑکے والے آتے۔ ان کی مانگیں چاچا کی حیثیت سے زیادہ ہوتیں۔ لڑکا کیا کرتا ہے؟ یہ سوال پوچھنے پر وہ جواب دیتے، تمہیں کیا کرنا ہے اس کے ساتھ؟ یہ سن کر چاچا کا پارہ چڑھ جاتا۔ وہ ان کی بری طرح سے بے عزتی کر دیتے۔ آہستہ آہستہ انھوں نے لڑکے کی تلاش بند کر دی۔ البتہ سیّد کی شادی کر دی۔

چاچا نے گھر میں ایک چپلوں کا ہار تیار کر کے رکھا تھا۔ ان کی حیثیت سے مطابقت نہ رکھنے کے باوجود اگر کوئی رشتہ مانگنے ان کے یہاں پہنچ جاتا تو وہ ہار کی جانب اشارہ کر دیتے۔ رشتہ مانگنے والا تلملا کے رہ جاتا اور برادری میں ان کی برائی کرنے میں کسر نہ چھوڑتا۔ لڑکی کا باپ ہو کر اتنا مغرور ہے کہ ہمیں چپلوں کا ہار دکھاتا ہے۔ لڑکی کو گھر میں بٹھا کر کیا پوجا کرے گا؟

اس طرح کئی سال بیت گئے۔ فاطمہ کی شادی نہ ہو سکی۔ چاچی اندر ہی اندر گھٹتی رہی۔ مگر ان کے پاس اس کا علاج نہ تھا۔ اسی غم میں وہ دنیا سے رخصت ہو گئی۔ بڑھاپے میں چاچا اکیلے رہ گئے۔ فاطمہ کی عمر بھی کافی ہو چکی تھی۔ اب وہ دن بھر باپ کے پیچھے بیٹھ کر سوت کاتتی۔ دودھ دوہنے میں اپنے بھائی کا ہاتھ بٹاتی۔ پھر چاچا بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

سیّد پہلوان کے دو چھوٹے لڑکے ہمارے ساتھ کھیلنے کے لیے آتے۔ وہ فاطمہ کو بوا کہہ کر آواز دیتے۔ فاطمہ کو میں نے اسی وقت دیکھا۔ تب وہ ادھیڑ عمر کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔ بھائی کی گرہستی میں اس نے اپنے آپ کو ڈھال لیا تھا۔ اب اس گھر میں لڑکیاں پیدا نہیں ہوتی تھیں۔

رستم جی چاچا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب مجھے تم ہی بتاؤ، میں نے گھر میں چپلوں کا جو ہار بنایا تھا وہ ٹھیک تھا نا۔“

میں خاموش رہا۔ کیا جواب دوں؟ میں یہی سوچ رہا تھا۔ اب میں بھی ایک لڑکی کا

www.urduchannel.in

باپ ہوں۔ اس نے تعلیم حاصل کر لی ہے۔ اس کی شادی کی عمر ہے۔ چاچا کا جو رویہ تھا اس کا مطلب اب میری سمجھ میں آ رہا ہے۔ اس زمانے میں لالچی لوگوں کے ساتھ انھوں نے جو برتاؤ کیا تھا وہ مجھے درست لگ رہا تھا۔

''چاچا جی۔ تم نے جو برتاؤ کیا تھا وہ اسی لائق تھے۔'' میں نے ان سے کہا۔

یہ جواب سن کر ان کا چہرہ روشن ہو گیا۔ ''اتنا ہی سننے کے لیے میں تمہارے پاس آیا تھا۔'' جاتے ہوئے ان کا چہرہ بے حد معصوم لگ رہا تھا۔ انھیں اپنی بے گناہی کا ثبوت مل گیا تھا۔ زمین پر دونوں ہاتھ ٹیک کر وہ اٹھے ہاتھ میں لکڑی تھامی اور مجھ سے کہا۔ ''اچھا۔ چلتا ہوں۔'' لکڑی ٹیکتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ جا رہے تھے۔ ان کی پیٹھ دکھائی دے رہی تھی۔ ریت پر چلتے ہوئے ان کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ گیٹ کھلنے اور بند ہونے کی آواز نہیں آئی۔

صبح میری بیوی نیند سے بیدار ہوئی۔ مجھے ٹیبل پر سر رکھے سوتا ہوا دیکھ کر اس نے کہا۔ ''کیا رات نیند نہیں آئی؟'' کتنی دیر تک جاگتے رہے؟ طبیعت میں کسل مندی نظر آ رہی ہے۔ تھوڑی دیر بستر پر سو جایئے۔

''رات میں رستم چاچا ملاقات کے لیے آئے تھے، اسی وقت وہ اٹھ کر گئے ہیں۔''

اس نے میری طرف حیرت سے دیکھا اور بولی۔ ''وہ اب کیسے آ سکتے ہیں بھلا؟

''مگر پھر بھی وہ آئے تھے۔ اپنی بیٹی کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی انھوں نے۔''

میری بیوی اب بھی محو حیرت تھی۔ میں نے باتھ روم میں جا کر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے چہرے اور آنکھوں پر مارے۔

''اپنی لڑکی کو دیکھنے کے لیے لڑکے کے رشتہ دار آنے والے ہیں۔'' میری بیوی نے کہا۔

یہ سن کر میں نے بیوی سے کہا۔ ''گھر میں جتنی بھی پرانی چپلیں ہوں، انھیں ڈھونڈھ نکالو، اس سے پہلے کہ میری بیوی اپنا ردعمل ظاہر کرتی، میں پرانی چپلیں تلاش کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

منّت

مدھو کر دھرما پوری کر

رحمت بی رکی۔ ریحانہ کی پیٹھ پر بچّہ لدا ہوا تھا۔ سر پر ٹوکرا، جس میں کنڈے، سوکھی لکڑیاں تھیں۔ جس سے اسے چلنے میں دقت ہورہی تھی۔ پیٹھ پر جو بچّہ تھا، وہ تھا محمود۔ وہ پاس آئی۔ دونوں پھر چلنے لگیں۔

"تیرے کو بولتی، اپن جائیں گے وھاں۔"

"کھاں؟"

"سانور گائوں!" رحمت بی نے اس کی پیٹھ پر لدے بچّے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

دوپہر سے ان کی اس بات پر بات چیت چل رہی تھی۔ بہت دوا دارو کیا، کئی درگاھوں پر گئی، گنڈے، تعویذ باندھے، پھر بھی محمود ٹھیک نہیں ہورھا تھا۔ پیٹ پھول کر ڈھول ہو گیا تھا۔ ھاتھ پائوں سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ وہ گردن لٹکائے

www.urduchannel.in

بیٹھا رہتا۔ اب تو سات آٹھ دنوں سے سوتا ہی رہتا ہے۔ ریحانہ کو کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ اس کا دل کام میں بھی نہیں لگ رہا تھا۔ کپاس چنتے چنتے وہ اسی کے بارے میں بولتی رہتی۔

''وہاں کیا ہے؟''

''کل منگل ہے، وہاں دیوی کے پاس جائیں گے۔''

چلتی ہوئی ریحانہ رکی۔ رحمت بی کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھتی رہی۔

''دیوی کے پاس؟'' اس نے حیرت سے سوال کیا۔

''ہاں، کل منگل ہے، دیوی کا دن ہوتا ہے۔ وہاں جا کے محمود کو دیوی کے سامنے رکھ کر دعا مانگیں گے۔'' رحمت بی کہنے لگی۔ مگر ریحانہ نے منہ بنایا۔ لکڑیا چننے سے آئی کھرونچ کو وہ سہلانے لگی۔

''لیکن وہاں آنے دیتے کیا اپنے کو؟''

''نہیں آنے دینے کو کیا ہوا؟ بہت جاتے اپنے والے وہاں!'' رحمت بی نے کہا۔

''ممدو کی بیماری اور اس سے پریشان ریحانہ کو دیکھتے ہی رحمت بی کا دل پگھل جاتا، ریحانہ جانتی تھی۔ سات آٹھ زچگی سے رحمت بی تجربہ کار تھی۔ مگر ریحانہ کے بچے زندہ ہی نہیں رہتے تھے۔

''اپنی درگاہ پر ان کے کتنے لوگ آتے ہیں۔ چندار کے حاجی سیاں کو تو برہمن بھی آتے ہیں۔''

''ہاں وہ تو ہے..... مگر یہ کیا بولتے.....'' ریحانہ کی آواز میں فکر تھی۔

''کون، تیرا مرد؟''

''ہاں.....''

''ارے اس کو کیا بولنے کا؟ وہ تو کم بخت گھومتے ہی رہتا ہے۔ اپنے ہی کو کرنا پڑتا سب۔''

''لیکن؟''

''تو چپ بیٹھ۔ تیرا تو مرد ابھی چار دن نہیں آتا۔ ہوٹل کی ڈیوٹی بولے تو اس کو

www.urduchannel.in

فرصت کہاں ملتی؟ اور آیا تو گھر میں بول کے رکھیں گے۔ علاج کو گئے ہیں۔"

رحمت بی کی باتوں کا ریحانہ پر اثر ہونے لگا۔ اس کے لفظوں سے ریحانہ کو سب کچھ آسان لگنے لگا۔ بچے کی فکر میں ڈوبی ریحانہ کو رحمت بی کا سہارا محسوس ہوا۔ اس کا مرد چار چار دنوں کے بعد آتا۔ آتے وقت مدو کے لیے شکری کی جلیبی اور سیو کی پڑیا لاتا، گہرے لال رنگ کی پتلی سی لنگی لپیٹ کر بچے کو سنبھالتا۔ پھر ریحانہ کام پر اکیلے ہی جاتی۔ کبھی کبھی شوہر کے ساتھ وہ شہر کے ڈاکٹر کے پاس مدو کو علاج کے لیے لے جاتی۔ واپسی پر اس کا شوہر اسے بس میں بٹھا دیتا۔ مدو کے لیے ہوٹل سے چوڑا، پیڑے باندھ دیتا۔ گیلی، سخت لال انگلیوں سے مدو کو سہلاتا، ہوٹل کے کام کی وجہ سے اس کی انگلیوں کی چمڑی چھل گئی تھی۔ ریحانہ کو لگتا ابھی خون نکل پڑے گا۔ نظر بچا کر وہ شوہر کو، پھر مدو کو دیکھتی۔ شہر سے آنے پر ریحانہ کو سونا سونا سا لگتا۔ ڈری سہمی ریحانہ کو ایسے میں رحمت بی کا ساتھ بڑا ضروری لگتا۔

جیسے جیسے گاؤں نزدیک آنے لگا، ویسے ویسے رحمت بی کا کہنا اسے صحیح لگنے لگا۔ سانور گاؤں جائے "دیوی" کے سامنے بچے کو لٹا کر منت مانگے۔..... میرے بچے کو ٹھیک کر ماں..... میں....." آگے اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

"کل کام بھی نہیں ہے....."

"ہاں۔ اب دو چار دن کپاس کہاں آتی چننے کو؟ اس لیے بول رہی ہوں، اپن صبح جائیں گے۔ وہ پہلی بس ادھر سے نکلتی ہے نا؟"

"ہاں۔"

"پھاٹے پر جائیں گے۔ وہاں سے سات بجے سانور گاؤں کی بس ملتی ہے۔ آدھے گھنٹے میں پہنچ جاتے وہاں..... میں گئی تھی نا، دو بار وہاں۔"

"وہاں جا کے پاؤں پڑنا اور....."

"ہاں۔ بہت بڑا مندر ہے۔ پہلے ناریل لینا، وہ سب پڑیا باندھ کے دیتے۔ ہلدی، کھڑی شکر، وہ لے کے دیوی کے سامنے جانا۔ وہ بمن کو سب پڑیا دینا اور دعا مانگنا، بس....."

www.urduchannel.in

''ہاں۔'' کھوئی ہوئی سی ریحانہ کی آنکھوں کے سامنے سارا منظر دکھائی دینے لگا۔

''اور پھر باہر آکر ناریل پھوڑنا، مندر کے بازو سے گھوم کر پھر وہ کھوپرے کے ٹکڑے چار لوگوں میں بانٹ دینا۔ بس!''

اسی کے ساتھ رحمت بی نے سانور گاؤں کی دیوی کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں۔ ''منّت پوری کرنے والی وہ دیوی ہے۔ اس کے لیے سبھی ایک ہیں۔ اور ہاں.....''

رحمت بی امنگ بھرے انداز سے کہنے لگی، دسہرے کے پہلے دن تو وہاں بکرا کاٹتے .....وہاں کا رواج ہی ویسا ہے۔''

کہاں۔ وہ مندر میں؟ ریحانہ کی آنکھیں پھٹی سی رہ گئیں۔

''ہاں۔ دیوی کے سامنے ہی! اپنے کو کچھ نہیں ہوتا۔ تو چل اب اتنے ڈاکٹر تو ہو گئے، درگاہیں ہو گئیں، منتیں ہوئیں، لیکن کچھ فائدہ ہوا تیرے بچے کو؟''

''نہیں نا.....''

''اب وہاں دیکھیں گے۔ تیرا ممدو ٹھیک ہو جائے گا۔ تو فکر مت کر۔''

ریحانہ اور رحمت بی گھر پہنچیں۔ ایک ہی باڑے میں وہ دونوں رہتی تھیں۔ کمر کے بٹوے سے ریحانہ نے چابی نکالی، تالا کھولا، پیٹھ پر بندھے ممدو کو زمین پر سلایا۔ پانی لیا اور بیٹھی۔ بچے کی طرف دیکھتے ہی پانی بھی گلے سے نیچے نہیں اترا۔ اس کے ماتھے پر انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ بول پڑی، ممدو.....ممدو رے.....'' اس نے آنکھیں کھولیں۔ سونی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ اس کے گلے میں دو تین گنڈے، تعویذ تھے۔ پاؤں میں کالے اون کا ڈورا بندھا تھا۔ پھولا ہوا پیٹ، پچکے گال اور سونی نظر۔ ریحانہ نے اسے اٹھا کر بٹھایا۔ ممدو بھی دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔

شام کے وقت سبھی کام کر کے لوٹ آ رہے تھے۔ گاؤں میں شام کی چہل پہل ہونے لگی۔ چولہے جل اٹھے، دھواں اٹھنے لگا، بچوں کا رونا، چیخنا، چلّانا سنائی دینے لگا۔ پنچایت کے پھونپو سے ریڈیو کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جانوروں کو ہانکنے کی آواز، ان کی

www.urduchannel.in

گردن میں بندھے گھنگروؤں کی آواز اور کھروں کی آواز سنائی دینے لگی۔ ریحانہ کے باڑے میں چار بیلے تھے۔ ڈوری کھینچ کر چلا رہے تھے۔ دن بھر ادھر ادھر گئی مرغیاں لوٹ کر آنے لگیں۔ ٹوکرے کے اردگرد منڈرانے لگیں۔ رحمت بی نے چولہا جلایا۔ اس کے بچے چلا رہے تھے۔ بڑی لڑکی بکری کا دودھ ایلومینیم کے برتن میں نکال رہی تھی۔ اس سارے شور وغل میں ریحانہ ممدو کی پیٹھ سہلاتے ہوئے اکیلے بیٹھی تھی.....!

''روٹی نہیں بنانا ہے کیا ریحانہ؟'' رحمت بی نے ادھر سے آواز لگائی۔

''وہ اٹھی، چولہا جلایا، پھٹی ہوئی آواز سے رونے والے ممدو سے بولنے لگی۔'' وہ دیکھ چاچا آئے، چپ بیٹھ!''

باڑے کے دروازے کو دھکیل کر رحمت بی کا شوہر آیا۔ چرمراتے جوتوں کی آواز نے اس کے آنے کی اطلاع دی۔ سر سے گھاس کا گٹھا پٹکا، جوتے نکالے، صافہ نکال کر سر کھجلایا۔

''افضل کہاں گیا؟ دکھائی نہیں.....'' اس نے پوچھا۔

''کہاں مرا؟ صبح بولی تھی چل میرے ساتھ۔'' روٹی تھپتھپاتے ہوئے رحمت بی نے کہا۔

ہاتھ پاؤں دھوکر صافے سے پونچھتے ہوئے رحمت بی کا شوہر آیا اور ''یا اللہ'' کہتے ہوئے کھاٹ پر ستانے لگا۔ روٹی بناتے ہوئے ریحانہ کو باہر آنگن دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے دودھ میں روٹی کے ٹکڑے ملائے اور کٹوری ممدو کے سامنے رکھی۔ دو انگلیوں سے وہ دھیرے دھیرے کھانے لگا۔ ریحانہ بھی روٹی کھائی۔

''کل سانور گاؤں جاتے ہم لوگ۔'' چارپائی پر آرام کرتے ہوئے شوہر سے رحمت بی نے کہا، تبھی ریحانہ مٹکے کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔

کیوں جا رہے ہو؟ اس نے پوچھا۔

ریحانہ کے ممدو کی طبیعت درست نہیں ہو رہی ہے نا۔ وہ دیوی کو دکھا کر لاتے۔''

''ہاں۔'' وہ اٹھ بیٹھا۔

www.urduchannel.in

پھیلی ہوئی چاندنی باڑے میں سے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ گاؤں کے لوگ سو گئے تھے۔ دوسرے محلوں سے گاؤں ....کی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ رحمت بی، اس کا شوہر اور ریحانہ باتیں کر رہے تھے۔ سفید سر کے بال، سفید داڑھی اور کالے رنگ کی وجہ سے اس کا شوہر بوڑھے بندر سا ریحانہ کو لگ رہا تھا۔ وہ اپنی منحنی آواز میں بڑبڑا رہا تھا۔ بے سر پیر کی باتیں کر رہا تھا۔ گاؤں کے بوڑھے بیلے کے پاس پیلیاں کی دوگلی ملتی ہے۔ بالکل اکسیر علاج۔ پیپل کے باڑے کا کلمی پاؤں کی لچک ٹھیک کر دیتا ہے۔ گاؤں باہر ......مسجد کا بوڑھا امام، پیش امام بولتے اس کو۔ بھوت پریت کو بھگانے میں ماہر ہے۔ سارا گاؤں اسے مانتا ہے۔ پیٹ کی گڑبڑ پر گاؤں کے باہر کی بڑھیا پانی پر منتر پھونک کر دیتی ہے.........."

لیکن ممدو کی بیماری سب کی سمجھ سے پرے تھی۔ دو تین تعویذ، تانترک کے تعویذ، شہر کے ڈاکٹروں کا علاج، درگاہ پر منتیں.........کسی سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ جنم سے تیسرے چوتھے دن ہی مرے ہوئے دو بچے اسے یاد آتے ہیں تو وہ ممدو کے پاس جا بیٹھتی۔ دوا کی گولیاں لیتے وقت ممدو روتا نہیں، صرف منھ بناتا، ہونٹ بھینچے رہتا، دانتوں پر دانت بھینچ کر امی......امی کرتا رہتا۔ بالوں سے عاری اس کا سر اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں..........یہ سب دیکھ کر ریحانہ کا دوا دارو سے بھروسہ اٹھ گیا تھا۔ پچھلے تین چار دنوں سے تو وہ ٹھیک طرح سے سو بھی نہیں سکی۔ ممدو کی فکر اسے کھائے جا رہی تھی۔

ممدو کا باپ اسے گود میں لے کر بیٹھتا اور دیر رات تک رحمت بی کے شوہر سے باتیں کرتا رہتا۔ ریحانہ جب پیچھے پڑ جاتی، تب ممدو کو شہر لے جاتا، ڈاکٹر کو دکھاتا۔ یہی سب اس کے دل میں آ جا رہا تھا۔

فجر کے وقت رحمت بی نے ریحانہ کو آواز دی۔ بکری کے دودھ کی چائے چولھے پر چڑھائی دونوں نے چائے پی۔ ریحانہ نے پلاسٹک کی جالی والی تھیلی میں ٹھونس کر رکھا ہوا پرانا برقعہ نکالا۔ گردن میں برقعے کی ڈوری باندھی۔ ممدو کو گود میں لیا۔ میلا کپڑا اسے اوڑھایا۔ تالا لگا کر چلنے کے لیے تیار ہوئی۔

"ساتھ میں کچھ لینا ہے کیا؟" اس نے پوچھا۔

www.urduchannel.in

نہیں، کیا ضرورت ہے؟ پن وہاں ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچتے۔ دوپہر کے پہلے ہی واپس آجائیں گے۔ اور ہاں، کھا کے نہیں جانے کا وہاں!'' کہتے کہتے رحمت بی نے چپل پہنی۔ اس کے بچے سوئے ہوئے تھے۔ شوہر نماز ادا کرنے گیا تھا۔ ٹوکری اٹھا کر اس نے مرغیوں کو چھوڑ دیا، دروازہ لگایا اور دونوں چل پریں۔

موڑ پر آتے ہی انھیں سانور گاؤں جانے والی بس آتی ہوئی دکھائی دی۔

''دیکھ تیرے کو بولی تھی نا، وہ دیکھ بس آگئی۔'' رحمت بی بس کو دیکھتے ہی چہک اٹھی۔ ممدو جاگ گیا تھا اور ممیاتی آواز میں رونے لگا۔

دونوں سانور گاؤں اتریں۔ ہوٹل پر گئیں۔ منہ ہاتھ دھویا۔ چائے پی۔ ممدو نے آدھی ساسر چائے پی اور منہ بنایا، دانتوں پر دانت رکھے، بنا آواز امّی .....امّی ..... کرنے لگا۔ بچی ہوئی چائے ریحانہ نے پی ڈالی۔ منگل کا دن ہونے کی وجہ سے لوگوں کی بھیڑ بڑھ رہی تھی۔ الگ الگ ندی نالے مل کر ایک دریا بن جاتے ہیں، اسی طرح گلی، کوچے سے لوگ آکر مندر کی جانب بڑھ رہے تھے۔ اسی بھیڑ میں رحمت اور ریحانہ برقعے کا پردہ اٹھا کر آگے بڑھنے لگیں۔ رحمت بی کی امنگ بھری باتیں ریحانہ کو اب۔ بی دبی لگ رہی تھیں۔ وہ اس کی باتوں کا ہاں، ہوں میں جواب دے رہی تھی۔ اس کا سارا دھیان آس پاس چلنے والی بچے والیوں کی اور تھا۔

دور سے مندر کا کلس دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہوئے ریحانہ ممدو کو تھپتھپانے لگی۔ مندر کے سامنے دونوں طرف ناریل، پھول، ہلدی، کم کم، پرساد وغیرہ کی دکانیں تھیں۔ ایک دکان کے سامنے دونوں رکیں۔ رحمت بی نے ناریل کا دام پوچھا۔ پانی ہلا کر دیکھا۔ بڑا سا ناریل اور ہلدی، کم کم لیے۔ ریحانہ نے جھٹ سے ممدو کو زمین پر بٹھایا۔ کمر سے بٹوا نکالا۔ بٹوے میں دوا، ڈورے، چابی میں اٹکا ہوا مڑا تڑا دس کا نوٹ تھا۔ اس نے نکال کر دکان دار کو دیا۔ بس کے ٹکٹ پھینک دیے۔ دونوں ایک کونے میں گئیں۔ برقعے اتارے۔ سمیٹ کر تھیلی میں رکھ دیے۔ چپلیں، برقعے دکان دار سے کہہ کر اسی دکان پر رکھ دیے۔ وہیں ناریل کی جٹا رحمت بی نکالنے لگی۔ ریحانہ ادھر ادھر دیکھتی کھڑی تھی۔ اچانک بول پڑی

www.urduchannel.in

"..... لاؤ میں نکالتی۔" اور ناریل لے کر وہ جلدی جلدی جٹائیں نکالنے لگی۔ تبھی رحمت بی نے کہا۔ ..... "ارے۔ سب مت نکال۔ تھوڑا رہنے دے۔"

ریحانہ کے دل میں رحمت بی کے لیے احترام کا جذبہ جاگا۔

بڑے دروازے کی بڑی محراب سے وہ اندر آئیں۔ ہال میں بڑا سا نقارہ بج رہا تھا۔ آرتی شروع تھی۔ مداری کے کھیل سے بچہ اوپر سے تو لطف اندوز ہوتا ہے مگر دل ہی دل میں گھبراتا بھی ہے۔ ٹھیک ایسا ہی احساس ریحانہ کو ہو رہا تھا۔ آرتی کی آوازوں میں وہ کھو سی گئی۔ ممدو کی جانب دیکھ کر اس کے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ رحمت بی کے ساتھ قدم بڑھانے لگی۔ چاروں طرف دیکھا، کسی کا دھیان ان کی اور تو نہیں ہے۔ دیکھ کر اسے تسلی ہوئی ۔اس کی ہمت بڑھ گئی۔

مندر میں کوئی گھنٹہ بجا رہا تھا، کوئی پری کرما کر رہا تھا، کوئی ماتھا ٹیک رہا تھا تو کوئی پرساد بانٹ رہا تھا۔ دیوی کی بڑی سی مورتی اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں دیکھ کر ریحانہ کا گلا بھر آیا۔ اسے ہاتھ بھی تھرتھراتے ہوئے محسوس ہوئے۔

لا۔ ادھر لا۔ دھیمی آواز میں رحمت بی بولی۔

اس نے ممدو کو لے کر دیوی کے سامنے سلایا۔ دونوں نے گھٹنے ٹیک، ہاتھ پھیلا کر، آنکھیں موند کر دعائیں مانگیں۔ پھر اپنے دونوں ہاتھ چہرے پر گھمائے اور جھٹ باہر آئیں۔

"وہاں ناریل پھوڑنے کا!" رحمت بی نے جگہ بتائی اور ممدو کو گود میں لیا۔ پھر وہ ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ اور ریحانہ نے ناریل کو پتھر پر پٹک دیا۔

"ارے ٹھہرو۔" رحمت بی کی اچانک آواز سے ریحانہ گھبرائی۔ اس کا ہاتھ رک گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "عورتیں ناریل نہیں پھوڑتیں!" اس نے ایک آدمی سے کہا۔ "ماما۔ ناریل پھوڑ دیتے کیا؟"

اس آدمی نے ناریل پھوڑ دیا۔ رحمت بی نے جھٹ سے ناریل کا پانی انگلیوں کے پوروں سے ممدو کے ہونٹوں کو لگایا۔ اس کے ہلتے ہونٹ دیکھ کر ریحانہ تھرتھرائی، خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ دونوں نے پھر دعا کی۔ دھیمی آواز میں ریحانہ بول پڑی۔ "میرے بچے کو اچھا

www.urduchannel.in

رکھنا..... طبیعت سدھری تو میں....." الفاظ رک گئے۔ اس کی آنکھوں میں مندر سما گیا۔

وہ دونوں باہر آئیں۔ رحمت بی نے ناریل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کو ناخن سے کرید کر ممدو کو کھلایا۔

"تو جا کر ناریل کے ٹکڑے چار لوگوں میں بانٹ کر آ جا۔" رحمت بی نے کہا۔

اکیلے جانے میں ریحانہ گھبرائی، مگر جیسے جیسے ناریل بانٹنے لگی، اسے خوشی کا احساس ہوا۔ وہ امنگ سے بھر اٹھی۔ دور کونے میں مندر کا سیوک بیٹھا تھا۔ وہ چڑھاوے کی رسید بنا رہا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک الماری تھی۔ وہاں جا کر ریحانہ نے اس سے کہا "ماما۔ پرساد" اور ایک ٹکڑا اس کی جانب بڑھایا۔ ہاں، کہتے ہوئے سیوک نے بنا اوپر دیکھے اسے منہ میں ڈال دیا۔ ریحانہ خوش ہوئی۔

"چلو۔" اس نے رحمت بی سے کہا۔ دونوں ناریل کھاتے کھاتے باہر آئیں۔

"عورتوں نے ناریل نہیں پھوڑنا۔ ہے نا؟" ریحانہ نے پوچھا۔

"نہیں پھوڑنا! اور تو تو پگلی کی طرح ناریل پھوڑ رہی تھی۔"

"عورتوں نے ناریل پھوڑا تو دعا قبول نہیں ہوتی کیا؟"

"کوئی بھی نہیں پھوڑتا۔ وہ مرد یا بچوں کو پھوڑنا پڑتا ہے۔" دکان پر برقعہ چڑھاتے ہوئے رحمت بی سمجھا رہی تھی۔

ریحانہ کو اسی وقت اسی لمحے کی یاد آئی..... اس نے جلدی سے ناریل پٹکا تھا۔ پھر رحمت بی کے کہنے پر ایک آدمی کو دیا تھا..... ایک جھٹکے سے اس ناریل میں آئی ہوئی ہلکی سی دراڑ ریحانہ کو یاد آئی..... گود میں ممدو کو وہ تھپتھپانے لگی۔

اب اس کا دھیان رحمت بی کی باتوں سے اور مندر سے ہٹ گیا..... اور اسے صرف دکھائی دینے لگی ناریل کی وہ ہلکی سی دراڑ.....!!

☆☆☆

www.urduchannel.in

گھٹن

وبھا دزی شرور کر

گوند بستر پر لیٹا تھا مگر آنکھ نہیں لگ رہی تھی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی 'دل میں کشمکش جاری تھی آخر اس سے یہ سب کیسے ہو گیا؟ کیسے ذرا بھی خیال نہ رہا۔ اسی ایک خیال کی وجہ سے وہ پریشان تھا کبھی وہ بے بس ہو کر خود پر رحم کرتا' اپنی بھی بہن ہوتی صرف ایک........تو اچھا ہوتا'اس طرح بولنے چالنے والے لڑکے کیسے سب برداشت کرلیتے ہیں؟ ان کی بہنیں ہیں اس لیے؟ اس کا ذرا بھی ارادہ نہیں تھا مگر ایک قسم کی چڑ نے اس کی زندگی کی آدھی خوشیاں چھین لی تھیں کیا بہن اس خوشی کو لوٹا پاتی؟ پچیس سالہ زندگی میں تو کوئی تجربہ نہیں تھا کہ یہ کڑواہٹ کچھ کم ہو جاتی۔

www.urduchannel.in

لڑکیاں اس نے دیکھی تھیں مگر نزدیک سے نہیں، ساڑھے تین سال کا رہا ہوگا تب کی بات ہے، نرسری میں داخل کرایا گیا تھا۔ پچاس لڑکیاں، چھوٹی سی انگلی دانتوں تلے دبا کر گھبراہٹ کے ساتھ اس نے ایک بار ادھر نگاہ دوڑائی، مگر فوراً ہی لڑکوں میں گھل مل گیا، لڑکے پانی میں کھیلتے، باجی کپڑے بدلتیں، پہلی بار اسے تعجب ہوا۔ گووند تو اپنے جیسی نہیں ہے، وہ فراک پہنتی ہے کیوں کہ وہ الگ ہے۔ سب لڑکے لڑکیوں سے الگ ہوتے ہیں شاید! اس وقت بھی وہ سوچا کرتا تھا اس وقت بھی وہ سوچا کرتا کہ لڑکیوں میں کچھ کمی ہے۔ ضرور، اس روز گھر واپس آیا اور ماں سے پوچھ بیٹھا۔ امّی! گووند ویسی کیوں ہے؟ ماں نے بتایا لڑکی ہے نا وہ اس لیے۔

اس طرح گووند کا تجسس کچھ کم ہوا۔ پھر عادت پڑ گئی، پہلے کی طرح اس خیال نے اسے بے چین نہیں کیا۔ لڑکیوں کے رنگین فراک اسے بے حد پسند آتے، ان کے بال اچھے لگتے، اور اپنے کپڑے اور اپنے بال بھی اسے پیارے تھے۔ لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ کھیلتے، شور مچاتے مگر ایک بار شیام نے نیلو کو دھکیل دیا تو کیسے بھونپو بن کر روئی، کچھ لڑکوں نے کہا، لڑکیاں روتڑی ہوتی ہیں۔ یہ اس نے سنا اور بھول گیا۔

چھ سات سال کا ہوا چنگی نے اسے مارا، اس نے بھی دو گھونسے جما دیئے۔ روتی چیختی ہوئی ماسٹر صاحب کے پاس گئی اور وہ گووند سے سخت ناراض ہوئے۔ گووند جل بھن کر رہ گیا۔ بالکل صحیح ہے کہ لڑکیاں رونے دھونے والی ہوتی ہیں۔ خود چڑھاتی ہیں تو خوش ہوتی ہیں، دوسرا کوئی چڑھائے تو روتی ہیں۔ ہمیں ڈانٹ سننی پڑتی ہے، ان سے کوئی کچھ نہیں کہتا۔

اور یہ خیال اس کے دل میں زہر کی طرح پھیلتا گیا، مار پیٹ کرنا معمول تھا، لڑکیوں کو لڑکے ''روتڑی'' کہہ کر چڑھاتے اور لڑکیاں رویا کرتیں۔ لڑکے شکایت نہیں کرتے آپس میں ہی معاملہ سلجھا لیتے، مگر لڑکیوں کو بھی پر غصہ آتا۔ مت کھیلو ہمارے ساتھ..... شرارتی کہیں کے..... یہی سب روز کا کھیل، روز کی لڑائی۔

کئی لڑکے اپنی بہنوں کے بارے میں بات کرتے، ان کے ہر لفظ میں پیار محبت شامل ہوتا، گووند کے لیے یہ ناممکن سی بات تھی۔ وہ لڑکے دوسری لڑکیوں کو ''لڑاکو'' کہتے، چغل خور کہتے، مگر اپنی بہنوں کی تعریف کرتے، یہ گووند کے لیے نیا تجربہ تھا۔

www.urduchannel.in

اپنی اپنی بہنوں کے ساتھ مل جل کر کھیلنے والے لڑکوں کو وہ دیکھتا اور مسکرا کر دیکھتا ہی رہ جاتا۔ دوسری نخل خوریوں سے یہ الگ ہے؟ شاید ہو۔ اپنی بھی بہن ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔

پھر جب یہ پتا چلا کہ چوتھی کے بعد لڑکیاں، لڑکوں کے مدرسے، میں جائیں گی تو کئی لڑکوں نے ٹوپیاں اچھال اچھال کر شور مچایا۔ جاؤ جاؤ منہ کالا کرو۔ اب تم الکھ آنا چاہو مگر تمہیں کون آنے دے گا رونے والوں کا اسکول الگ ہے۔ اب جا کر وہاں خوب روؤ۔ بھاگو یہاں سے۔ آخری دن لڑکوں اور لڑکیوں میں کھمسان کی یا یہ لڑائی ہوئی۔ چھٹی کے بعد سب گھر چل دیے مگر کسی کے گھر میں باجی تھیں، کسی کے گھر میں منی، گووند کے ساتھ کھیلنے والی کوئی بہن نہ تھی۔

وہ گھر پہنچا "چلو چھٹی ہوئی!" وہ بولا "آج سے لڑکیاں ہمارے اسکول میں دکھائی نہیں دیں گی۔" اس کی آواز میں خوشی کی جھلک تھی۔

ماں نے ہنس کر کہا اگر اسکول میں لڑکیاں رہتی ہیں تو رہیں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ سننے پر گووند نے کتنی کہانیاں سنائیں لڑکیوں کی شرارتیں، لڑائیاں، ماں صرف ہنس کر رہ گئی۔ آگے پتہ نہیں کیا بات ہوئی۔ چھٹی جماعت میں گووند داخل ہوا تو جماعت میں بیس لڑکے اور بیس لڑکیاں دیکھ کر اسے کوفت ہوئی۔ لگتا تو یہ چڑیلیں یہاں ستانے کے لیے آئی ہیں۔ ان کی کیا ضرورت ہے یہاں؟

اسکول سے گھر لوٹتا تو اسے کئی واقعات یاد آتے اور اسے خاک کئے جاتے، پڑھانے کے لیے ماسٹر صاحب بھی تھے۔ اور باجی بھی۔ اگر کوئی لڑکا ڈھنگ سے پڑھائی نہ کرے تو ماسٹر صاحب اسے "سانڈ" کہہ کر مخاطب کرتے۔ مگر لڑکی پھسڈی بھی ہو تو اسے اپنائیت سے سمجھاتے۔ ایک وقت تو ایسا آیا کہ بیس میں سے صرف ایک لڑکی پاس ہوئی مگر ماسٹر صاحب نے بڑے اچھے انداز میں انھیں سمجھایا۔ "تمہیں محنت کرنی چاہیے اس طرح کام نہیں چلے گا۔" پھر فیل ہونے والے لڑکوں کو کھڑا کر کے بولے۔ "کیوں بے! کیا جائیداد لکھ رکھی ہے تمہارے باپ نے۔ پڑھتے کیوں نہیں ہو تم لوگ۔ ہاتھ آگے کرو، کیوں بے، ہاتھ کیوں چھپاتا ہے......... چھڑی سے ذرا مرمت کرتا ہوں۔ کھوپڑی میں کیا تیرے بھوسا بھرا ہے؟ گدھے کہیں کے، یہاں سے وہاں تک۔"

www.urduchannel.in

گووند آگ بگولا ہوگیا۔لڑکیوں کے بالوں میں تو جوئیں بھی ہوتی ہیں،اس نے سنا تھا۔تب ماسٹران پر کیوں ناراض نہیں ہوتے ،لڑکیوں کے سامنے بے عزتی کرتے ہیں، جیسے لڑکوں کی کوئی عزت ہی نہیں ہوتی۔وہ غصہ میں دہکتے ہوئے بولا۔ماسٹر صاحب! کوئی گدھا ہوتو بتائے۔''

یہ سن کر ماسٹر صاحب کو بے حد غصہ آیا۔انھوں نے نہ جانے کیا کیا گالیاں دیں۔ لڑکیاں ہنستی رہیں۔گووند زہر کی جگالی کرتا رہا!لڑکیاں شوخی اور ادا سے کہتیں ''ہائے'' اور اٹھلاتیں تو اسے حیرت ہوتی۔غصہ آتا،ان کا ہنسنا، چلانا، جھومنا،اسے بے مطلب اور بچکانہ لگتا،ماسٹر صاحب اس بات سے بے خبر رہتے، یہ بات آگ میں گھی ڈالنے والی تھی۔

لڑکیاں سوچتی ہیں،لڑکے کس کھیت کی مولی ہیں، بہت بدذات ہیں جہاں دیکھو اپنا حکم چلا لیتی ہیں۔آہستہ آہستہ اس کا دل نفرت سے بھرتا جاتا۔لڑکیوں کے نخرے دیکھ کر،ان کی ساڑیاں، پھولوں سے سجی چوٹیاں، بے وجہ شرمانا،اور بات بات مسکرانا پڑھی لکھی لڑکیاں سب ایسی ہی ہوتی ہیں۔میری ماں تو ایسی نہیں۔

کالج میں لڑکیوں کے اِردگرد منڈلانے والے لڑکوں کو دیکھتا تو بہت غصہ آتا وہ ان سب باتوں سے الگ تھلگ رہتا۔ایک بار مس گوداوری نے اس سے نوٹس مانگے اس نے دوٹوک جواب دیا۔''نوٹس کیا کریں گی آپ؟ میں نہیں دے سکوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا ۔سوچنے لگا لڑکی ہی تو ٹھہری کل چیختی ہوئی نظر آئے گی، میرے پیچھے پیچھے گھومتا ہے یہ لڑکا۔

کالج کی دنیا میں رہتے ہوئے بھی کبھی اتفاق سے لڑکیوں کے بارے میں سوچنے لگتا،افسانہ، کہانی، ڈرامہ، ناول میں تو عورتیں سمجھدار، فرماں بردار، قربانی دینے والی تو دکھائی دیتی ہیں۔کیا حقیقت میں ایسا ہے؟ وہ ان لڑکیوں کو دیکھتا تو سب غلط لگتا۔بہتر عورت اس نے ایک ہی دیکھی تھی اس کی اپنی ماں۔باقی لڑکیاں اور عورتیں اس کے لیے عجیب وغریب پہیلی تھیں۔

ایک بات اور اس کے دماغ میں گردش کرتی۔یہ لڑکیاں برابری کرنے کی ویسے تو لاکھ کوشش کرتی ہیں، یہاں تک کہ لڑتی ہیں جھگڑتی ہیں مگر برابری کرنے والی صلاحیتیں ہوتی بھی ہیں ان میں؟ بالکل نہیں۔سج دھج کر اور جھوٹا خلوص جتا کر متاثر کرتی ہیں۔اسے ذرا بھی

www.urduchannel.in

شک نہ تھا کہ مس گھائے گڑے محض لڑکی تھی اس لیے ماسٹر صاحب نے اسے زیادہ نمبر دے کر اسے نیچا دیکھنے پر مجبور کر دیتے تھے۔

ایک بار اسٹیشن پر ٹکٹ لینے کے لیے قطار میں ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔ میڈم ریشماں بڑی شان سے آئی اور قطار پر شانِ بے نیازی سے نگاہ کی، سیدھی کھڑکی کے پاس پہنچی ٹکٹ لیا اور چل دی۔ ٹکٹ بابو نے اسے ٹکٹ کیوں دیا؟ کیا ہمیں تکان کا احساس نہیں ہوتا ؟ کیا ہمارا وقت برباد نہیں ہوتا؟ برابری کا حق مانگتی ہیں تو ہماری طرح محنت سے کیوں کتراتی ہیں؟ کیوں رعایتیں چاہتی ہیں؟ ہر جگہ ہر قسم کی رعایتیں چاہتی ہیں۔

کبھی کبھی لڑکیوں کی نگاہ میں اسے دکھائی دیتا جیسے وہ کہنا چاہتی ہوں کہ لڑکے شہدے ہوتے ہیں تو اسے اور بھی نفرت ہو جاتی۔ کون بے تاب ہوتا ہے تم سے بات کرنے کے لیے؟ یوں ہی سوچتے ہوئے اسکول کی پڑھائی ختم ہوئی، کالج سے چھٹی پائی۔ گووند تھا کہ وہ لڑکیوں کے سائے سے بھی بھاگتا تھا۔

اسے راشتگ کے دفتر میں نوکری ملی تھی۔ خواتین کلرکوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دیکھ کر اس نے دل میں کہا، لیجیے یہاں بھی حاضر ہیں۔

ماں نے کہا، شادی کر لو اور جو لڑکی دیکھی، اس نے تو ہمت ہی توڑ دی۔ یہ شریو! وہی پھر اس نے چغلی کی تھی اس نے ماں سے صاف صاف کہہ دیا، امّاں مجھے ابھی شادی نہیں کرنی ہے۔ ماں نے سمجھایا بجھایا تو بولا۔ میں کم از کم پڑھی لکھی لڑکی سے شادی نہیں کروں گا۔"

دن بیتتے گئے۔ جب آفس میں خواتین کلرک چائے پلانے کی فرمائش کر کے اس کے قریب آنے کی کوشش کرتیں، اپنا کام چھوڑ کر فضول کی باتیں کرتیں اور جب ان کا ادھورا کام مکمل کرنے کے لیے اس پر بوجھ ڈالا جاتا وہ جل بھن کر رہ جاتا۔

آج بھی اسے کام پورا کرنے کے لیے دفتر میں جلدی جانا پڑا۔ بس کی راہ دیکھتا قطار میں کھڑا تھا راگنی آتی ہوئی دکھائی دی۔ اسی کے دفتر میں کام کرتی تھی۔ بس آتے ہی قطار کی پرواہ کیے بنا وہ آگے بڑھی اور بس میں سوار ہو گئی۔ وہ اس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ وہ تو غصے سے بھرا بیٹھا تھا۔

www.urduchannel.in

''کہیے مسٹر گووند! آج جلدی جا رہے ہیں؟'' اس نے کہا۔

اس نے صرف ''ہوں'' کہا۔ اور دوسری جانب دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

بس کنڈکٹر پاس آیا۔ گووند سے اس نے کہا۔ ''دو؟''

''نہیں ایک۔ گووند نے ذرا زور سے کہا۔ اور دوسری جانب دیکھنے لگا۔

راگنی بس میں بیٹھی تھی مگر بیسیوں بار پرس کھول کر شیشے میں منہ دیکھتی رہی، ایک چھوٹی سی لٹ ماتھے پر دھیمے سے بکھیر دی، ساڑی اتنی مہین کہ پیٹی کوٹ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہ ساڑی پہن کر وہ پہلی بار دفتر آئی تھی تو ہر نظر کام بھول کر اس کے بدن کو چھو کر رہ گئی، اور وہ تراشے ہوئے ناخن، نیل پالش سے رنگے ہوئے وہ ان سے بار بار کھیل رہی تھی۔ گووند نے دل ہی دل میں غصے سے کہا۔ یہ لڑکیاں یہاں کیوں جھک مارنے آتی ہیں، اس سے تو بہتر تھا کہ کسی فلم میں کام کریں۔''

وہ بھی سب کی طرح کبھی کبھی راگنی کو دیکھ لیتا مگر اس کی نظر میں صرف نفرت تھی۔

راگنی نے اپنی میز پر بیٹھے بیٹھے سب سے نگاہ چرا کر شیشے میں دیکھا اور گووند نے دھڑام سے اپنا رجسٹر پٹک دیا۔ پاس بیٹھے ہوئے کشا بھائی بولے۔ کیوں بھائی! معاملہ کیا ہے؟''

گووند چڑ کر بولا۔

''میں کہتا ہوں یہ دفتر ہے یا تھیٹر یا رنگ محل ہے۔ نوکری کے بہانے مردوں کو شکار کرنے چلی آتی ہیں یہ۔''

کشا بھائی ہنس کر رہ گئے۔ اتنے میں راگنی مٹکتی ہوئی ان کے پاس آئی اور سریلی آواز میں بولی۔ ''بھائی صاحب یہ کارڈ ہم سے بھرے نہیں جاتے، آج کام پورا نہیں ہوا تو صاحب لال پیلے ہوں گے، ذرا خانہ پری کر دیجئے نا۔''

کشا بھائی مجبور ہو کر مسکرائے اور اس کے کارڈوں کی خانہ پری کرنے لگے۔ راگنی دوسری سہیلی کے پاس باتیں کرنے پہنچ گئی۔

کشا بھائی بولے! مار دیا غریبی میں گیلا آٹا۔''

''تم سے کس الو کے پٹھے نے کہا کہ یہ کام ہاتھ میں لو۔'' گووند نے غصے سے کہا۔

www.urduchannel.in

''میں اگر منع کرتا تو صاحب حکم دیتے کہ مکمل کردو، اس سے تو بہتر ہے کہ خود ہی منظور کر لینا چاہیے۔ صاحب پر بھی وہ جادو کی چھڑی گھماتی ہے۔''

یہ نوکری کرنے آتی ہے یا شوہر ڈھونڈنے؟ خدا جانے۔'' سدو نانا نے کہا۔

اتنے میں سگونا اتراتی ہوئی آئی۔ ''سدو نانا بتایئے نا یہ کارڈ کیسے بھروں؟''

سدو نانا کے دکھتی گردن میں ٹیس اٹھی، چہرے پر مردنی سی چھا گئی، بجھے ہوئے لہجے میں کہا رکھ دیجئے۔''

تھینک یو، کہہ کر کارڈوں کا پلندہ سدو نانا کی میز پر رکھ کر اور ان کے پیپر ویٹ سے کھیلتے ہوئے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگی۔ کافی دیر تک بے معنی گفتگو کرنے کے بعد بولی۔ مسٹر گووند بہت زیادہ سیریس رہا کرتے ہیں۔''

غصے کی آگ نے گووند کو اندر تک دہکا دیا۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ چپ چاپ کام کرتا رہا۔ سگونا اس کی میز پر ذرا جھک کر بولی'' کیوں صاحب! کیا سنائی نہیں دیتا؟ یاد رکھئے پرموشن کی چائے پلائے بنا چھٹکارا نہیں ملے گا، ہاں!''

گووند ایک دم کھڑا ہو گیا اور ہاتھ اٹھا کر (جیسے طمانچہ رسید کر دے گا) بولا۔ شٹ اپ منہ توڑ دونگا ایک ایک کا۔ کام کے وقت کام کرنا نہیں جانتیں، کیوں کرتی ہیں نوکری؟ نخرے دکھا کر مردوں کو اپنے جال میں پھانسنے کے لیے، آتی ہو دفتر میں؟ گردن ٹوٹ جاتی ہے کام کر کے ہماری ، ہم پر اپنا کام لاد دیتی ہو، ہم نہ نوکر ہیں نہ خصم کام کرنا نہیں جانتی ہو تو نوکری کیوں کرتی ہو؟ ہم میں سے کسی نے کام لادا ہے تم پر؟ پرموشن کی چائے پلائے۔ تمہیں کیوں پلائیں؟ گووند میرے آگے پیچھے رہتا ہے اس طرح بدنامی کرنے کے لیے میری؟

سارے کلرک گووند کو سکتے کے عالم میں دیکھتے رہ گئے۔ زندگی بھر کی گھٹن، بند کی ساری دیواریں توڑ کر طوفان کی صورت میں بہہ نکلی، آج اسے راحت ملی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا، قلم اٹھا کر اس نے ماتھے کا پسینہ صاف کیا، اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنتا ہوا لکھنے لگا۔ کیا لکھ رہا ہے یہ اس نے نہیں دیکھا، نہیں جانا۔

☆☆☆

www.urduchannel.in

میرے خیال سے اردو مراٹھی کے ادبی لین دین کی تاریخ کا آغاز مناچے شلوک اس سمرتھ رامداس سوامی کی شاعری کا منظوم ترجمہ کرنے والے تراب علی چشتی نے کیا اور دھیرے دھیرے آدان پردان کی اس تحریک میں ڈاکٹر دلوی، ڈاکٹر رفیعہ شبنم عابدی، ڈاکٹر اسد اللہ، سلام بن رزاق، معین الدین عثمانی، انجم عباسی، وقار قادری ایسے کئی بڑے نام جڑ گئے۔ مراٹھی سے اردو میں ترجمہ کرنے والوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ کچھ لوگوں کو یہ کام ایک طرز معلوم ہونے لگا۔ مگر ایک نام ایسا ابھرا جو مراٹھی ادب کے مترجم کی حیثیت سے اب سب سے زیادہ مقبول ہے اور قابل تعریف بھی۔ وہ نام قاسم ندیم کا ہے۔

قاسم ندیم مراٹھی کے معیاری ادب سے واقف ہیں۔ مراٹھی سے سیدھے ترجمہ کرنے کا فن جانتے ہیں۔ خالد اکسکر کے بعد بہترین مراٹھی افسانوں کا انتخاب اردو میں لانے والے یہ واحد شخص ہیں۔ فلز لنگویج یا لنک لینگویج کے ذریعے دوسری زبان کے ادب کا ترجمہ اپنی مادری زبان میں کرنا قطعی غلط نہیں۔ مگر جب قاسم ندیم جیسے مترجم اوریجنل زبان سے سیدھے ترجمہ کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس ترجمہ کا معیار قابل اعتمادی ہوگا اور بال کی کھال نکالنے والے ترجمہ کے نقاد ایسے ترجمہ میں خامیاں ڈھونڈتے رہ جائیں گے۔

شاید اردو مراٹھی مترجموں کی ہماری پچھلی نسل اب ماند پڑ چکی ہے اور نئی تخلیق بھی نظر نہیں آتی جو ہمیں متاثر کر کے فوراً اس کا ترجمہ کروانے پر آمادہ کر سکے۔ قاسم ندیم جیسے نئے مترجموں سے یہ توقع ہم کرتے ہیں کہ جو ہم نہ کر پائے وہ کلاسک یا دور حاضر کی بہترین مراٹھی تخلیقات کو اردو کے قالب میں ڈھالتے رہیں گے۔

(ڈاکٹر رام پنڈت)

URDU CHANNEL Publications

7/3121 Gajanan Colony Govandi Mumbai -43 Ph 25556018, 25557484 Fax : 25567860 email : urduchannel@indiatimes.com

www.urduchannel.in